عیب نارمل

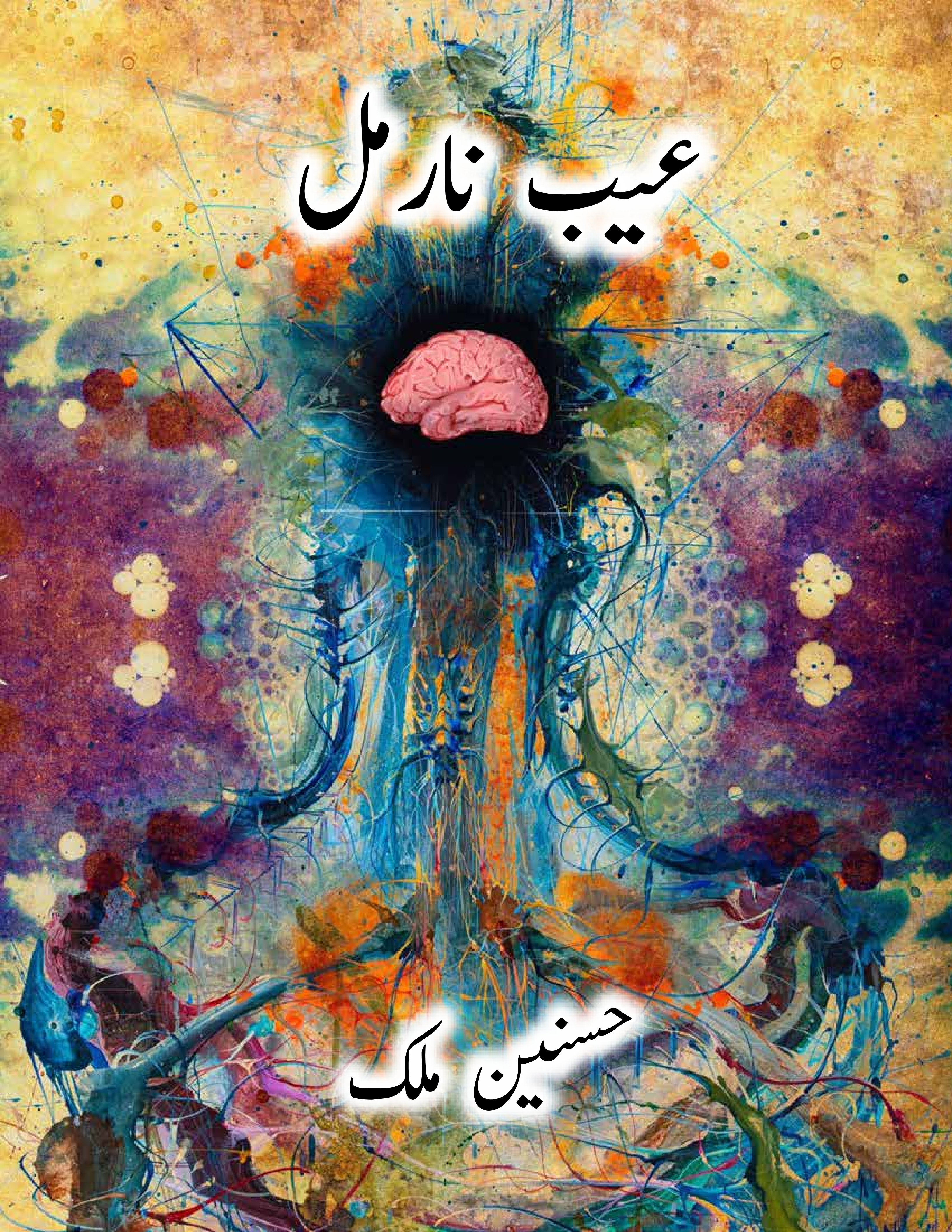

حسنین ملک

فہرست

نفسیات ہمارے ہاتھ میں ہے...........................5
مایوسی اور منزل...........................7
علم نفسیات...........................10
شعوری نکاح اور جنت الماوی...........................12
ہمارا ضمیر...........................14
دل کا راستہ...........................16
قلب سلیم...........................18
انسان معاشرتی جانور ہے...........................20
رنگوں کا بادشاہ...........................24
ابلیس اور عمل الصالحات...........................27
دھن پرایا اور بیٹیاں اپنی ہوتی ہیں...........................31
انسانی نفسیات اور محاورے...........................33
ہم سب سفر میں ہیں...........................35
انسانی نفسیات کے عجائب...........................39
سائیکالوجی اور بائیولوجی کا چولی دامن کا ساتھ ہے.........42
ہمارا نبی، ہم اور تھوڑا سا نفسیاتی فرق...........................44

مرد یہی کرتے ہیں............................49

کھردرا پتھر............................55

کیوں............................60

جلا ہوا قرآن............................65

دل کے رشتے............................71

چوپایوں کا اشرف المخلوقات............................76

سکون کیا ہے؟............................82

سریع الحساب............................89

میں اور میری تنہائی اکثر یہ باتیں کرتے ہیں............94

دو کٹہرے............................98

خدا ہی حافظ............................99

فیصلہ روز سنایا جا رہا ہے............................108

بچوں کی تربیت کیسے کی جائے............................113

دو غلاف............................117

سیرو فی الارض............................120

مردانگی............................126

پانی کا گلدستہ............................133

Poison vs Venom............................140

عظیم بدھاور تین جانور.............................144
کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ...148
جادوئی مشروب 153
7-38-55...157
خدا کا قہر..163
پیاز کے چھلکے...................................167
صرف دو کام.......................................172
کارنامے..177
تین دوست تین کہانیاں...........................181
محبت کا نقص.......................................188
صاحبہ و صاحب- قسط نمبر 1.......................192
معصوم گناہ - قسط نمبر 1...........................198
جھونپڑی کی نفسیات................................205
عیب نارمل...214

نفسیات ہمارے ہاتھ میں ہے

بچپن میں ہمیں سکھایا جاتا تھا تم نے فلاں سے زیادہ نمبر لیکر آنے ہیں۔

ہم جتنے کھیل کھیلتے تھے اس میں جیتنا فخر کی اور ہارنا شرم کی بات ہوتی تھی۔

ہم دفتروں میں آئے تو بتایا گیا تمھیں سب سے آگے بڑھنا ہے۔

یعنی ہر صورت میں دوسروں کو زیر کرنا ہے تب ہی ہم زبر ہو سکتے ہیں۔ ہماری جیت میں کسی کی ہار ضروری ہے۔

اس نفسیات کو لیکر جب ہم والدین بن جاتے ہیں تو ہم اپنے بچوں کو پھر اسی وبال کو کمال بنا کر سکھا دیتے ہیں۔

یوں یہ خاندانی مقابلہ ایک قومی نفسیات کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور نسل در نسل جاری رہتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ آج اپنا مقابلہ اپنے گزرے ہوئے کل سے کریں کہ ہم نے آج اپنے کل سے زیادہ بہتر

انسان بن کے دن گزارنا ہے، اپنے بچوں کو سکھایا جائے کہ انھوں نے اپنے ہی پچھلے امتحان سے زیادہ نمبر لانے ہیں۔ کھیل کا اصل مزہ اچھے کھیل میں ہے نہ کہ ہار جیت میں۔

قوموں کی نفسیات، خاندانوں کی نفسیات پر محیط ہوتی ہے، خاندانوں کی نفسیات فرد کی نفسیات کے مرہون منت ہے اور فرد کی نفسیات اسی فرد کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی میرے اور آپ کے ہاتھ میں ہے۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مایوسی اور منزل

ایک ڈاکٹر دوست نے مجھے سکھایا کہ بیماری اور علامت میں فرق ہوتا ہے مثال کے طور پر کھانسی کو عام طور پر بیماری سمجھا جاتا ہے جبکہ کھانسی بیماری نہیں علامت ہے کہ اندر کوئی بیماری ہے، دوسری مثال یہ کہ بخار بیماری نہیں علامت ہے کہ اندر بیماری ہے۔ انسان کو پتہ ہی نہ چلتا کہ اسکے اندر بیکٹیریا پھیل رہے ہیں مگر جسم گرم ہو کر اظہار کر دیتا ہے کہ اندر کوئی مسئلہ چل رہا ہے۔

یہ اصول بہت سے نفسیاتی مسائل اور ان کا حل سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے۔ جیسا کہ خود کشی پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ خود کشی مسئلہ نہیں، مسئلہ کہیں اور تھا جسکا نتیجہ خود کشی ہے۔ ایک واضح وجہ ڈپریشن ہے جو انسان کو خود کشی کی طرف لے جاتا ہے۔

یہی اصول ڈپریشن پر لاگو کریں تو سمجھ آتی ہے کہ ڈپریشن بذات خود نہیں ہوتا اسکی بڑی وجہ مایوسی ہے، کبھی کچھ چاہنا اور نہ کر سکنا، کبھی بہت کوشش کرنا پھر بھی حاصل نہ کر پانا، کبھی کچھ کر جانا مگر پتہ چلنا کہ یہ نہیں کرنا تھا اور واپسی کا راستہ نہ ڈھونڈ پانا، یہ سب مایوسیاں

ڈپریشن کو جنم دیتی ہیں۔

مایوسی کیوں ہوتی ہے؟ انسان جب اپنے علم کے مطابق تمام کوششیں کر بیٹھتا ہے اور مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر پاتا تو مایوس ہو جاتا ہے۔ جیسے دو میاں بیوی یا دونوں میں سے ایک جب ساری کوششیں (اپنے علم کے مطابق) کر بیٹھتے ہیں تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں یہ مایوسی ڈپریشن بناتی ہے اور ڈپریشن کے دوران کیے گئے رویے طلاق کا باعث بنتے ہیں۔

غور کریں ایک پانچ سالہ بچہ ماں باپ سے کسی بھیڑ میں بچھڑ جائے تو وہ صرف ایک لمحہ کے لئے نظر دوڑائے گا، والدین کو تلاش کرنے کے لیے اور نہ نظر آنے کی صورت میں رونا اور چیخنا شروع کر دے گا کیونکہ اسے نہ دیکھنے کے بعد مایوسی ہوئی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ یہی عمل اگر 12 سال کے بچے کے ساتھ کیا جائے تو اس کا رد عمل مختلف ہوگا۔ وہ لوگوں سے پوچھے گا، اپنا تعارف کروائے گا یا ہو سکتا ہے کسی سے اپنے والدین کو فون کروا کر رابطہ کر لے گا۔ ان دونوں بچوں میں صرف والدین کو تلاش کرنے کے علم کا فرق تھا۔

جب تک ایک بھی راستہ یا طریقہ موجود ہو انسان کے ذہن میں، انسان

اس طریقے یا راستے کو اپنا کر کوشش میں لگا رہتا ہے، جب اسکے علم کے مطابق سارے راستے ختم ہو جائیں تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔

منزل تک پہنچنے کا، مقصود حاصل کرنے کا یا تلاش کرنے کا علم جہاں ختم ہو جائے گا وہیں سے مایوسی کی سرحد کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اگر مطالعہ، تجربہ، تجزیہ، حالات سے نمٹنے کے گُر یا پھر مختلف طریقوں سے ایک ہی منزل کو حاصل کرنے کا حوصلہ اور ہنر سیکھ لیا جائے تو مایوسی نہیں آ سکتی۔

علم، کوشش اور لگن، مایوسی کی ضد ہیں۔ علم، کوشش اور لگن منزل و مقصد کی طرف جاتے ہیں جبکہ ان کا اختتام مایوسی کی طرف۔

اللہ ہمیں منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے اور جو مایوسی کی طرف لے جانے والا ہو اسے شیطان کہتے ہیں۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

علم نفسیات

آپ اس علم کی تعریفات، اس کے اصول اور اس کی اقسام پڑھ بھی سکتے ہیں اور سمجھ بھی مگر یہ سب کچھ مل کر بھی آپ کو ماہر نفسیات نہیں بنا پاتا۔ آپ ارسطو و افلاطون کے عقلی مقالات، ابن خلدون و رشد کے سماجی و ذہنی اختراعات، فرائڈ و کانٹ کے تجزیات و تجربات کا بغور مطالعہ کر سکتے ہیں مگر یہ معلومات ماہر نفسیات نہیں بناتیں۔

ایسا کیوں ہے؟

ماہر نفسیات، اوپر بیان کی گئی ساری معلومات کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی روزمرہ کی زندگی چلتے پھرتے انسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ گھر کے افراد کے رویوں اور جملوں پر برا ماننے کی بجائے انھی کو مواد بنا کر اپنی تعلیم کا آغاز کرتے ہیں۔ گھر سے باہر نکلتے ہیں سڑک پر پیدل چلنے والوں، موٹر سائیکل سوار، گاڑی کے حامل، بسوں پر سفر کرنے والوں، دفتروں میں صفائی کرنے والوں سے لیکر بلند ترین سطح پر کام کرنے والوں کی باتوں، ان کے چہروں، ان کے لباس، ان کو اچھی ترین لگنے والی باتوں سے لیکر

جھگڑے کے مسائل تک، ان کی خوشیوں اور ان کے غموں کے دوران ان کے رویے اور حوصلے، حتیٰ کہ ان کے بولے گئے جھوٹ اور غیبت پر بھی کڑھنے کی بجائے اس کو علمی مواد کی شکل دے کر اپنے شعور کی لائبریری میں ایک نفسیات کے سیکشن میں ایک کتاب بنا کر سجا دیتے ہیں اور بوقت ضرورت اس سب مواد و معلومات کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

کسی بڑے آدمی نے کہا تھا علم ہمیشہ معلومات کے تابع ہوتا ہے یعنی جتنی معلومات زیادہ اور موزوں ہوں گی علم اتنا ہی جاندار اور کامل ہوگا۔

میرے ایک گرو کہا کرتے تھے پینٹر بنتے نہیں، پیدا ہوتے ہیں، آپ برش چلانا سیکھ سکتے ہیں مگر پینٹر نہیں بن سکتے۔ مجھے لگتا ہے نفسیات کی مہارت بھی ایسی ہے۔ بہت سے ماہر نفسیات بھی صرف نفسیات کی معلومات رکھتے ہیں، علم نہیں۔

ہم کتابیں اور باتیں پڑھ سن سکتے ہیں مگر ماہر نفسیات نہیں بن سکتے۔ یہ پیدا ہوتے ہیں اور ہر دور میں ہوتے رہیں گے۔ واللہ اعلم

شعوری نکاح اور جنت الماوی

ایک ضروری نکاح ہوتا ہے

لوگ کہتے ہیں اس کی عمر ہو گئی ہے، نکاح کر دو
اب اس کی نوکری ہو گئی ہے نکاح کر دو
لڑکی یا لڑکا بگڑ نہ جائے یا بگڑ گئے، نکاح کر دو
کئی والدین کہتے ہیں ہم بوڑھے ہو رہے ہیں، بچوں کی خوشیاں دیکھنی ہیں تو نکاح کر دو
ان سب کو اور اس طرح کی اور رسومات کو ضروری نکاح کہتے ہیں جس میں کسی نہ کسی سماجی، معاشرتی، معاشی یا جسمانی ضرورت کے تحت نکاح کر دیا جاتا ہے۔

ایک اور کائنات اس کے بالکل برابر میں چل رہی ہوتی ہے جسے انسان کا شعور کہا جاتا ہے۔

جہاں انسان اپنے شعور کی سمجھ ، اسکی ترقی ، اس کی تشفی و تسلی و تسکین کے لیے ،سوچ کے تبادلے اور اس تبادلے میں اختلاف کے باوجود ایک حسین گفتگو کے لیے،

اس حسین گفتگو کے دوران بھی کسی کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کے لیے، کسی کی چھوٹی سی کاوش کو تسخیر کائنات بنا کر، نکھار کر پیش کرنے کیلئے، جہاں گھر بنانے کی بجائے دل میں گھر کرنے کیلئے
یا پھر کسی کا ہاتھ تھام کر اس کو ایسا احساس دلانے کے لیے جیسا ایک چھوٹے بچے کو بھیڑ میں اپنی ماں کی انگلی پکڑ کر ہوتا ہے۔
نہیں تو پھر کسی کے صرف جسم کی حد سے نکل کر اس کے اندر کی خوبصورتی کو نکھارنے کے لیے اور جب نکھر جائے تو اس کی مزید قدر کرنے کے لیے

ایسے نکاح کو شعوری نکاح کہتے ہیں

معاشرے میں بھلے ایسے شعوری میاں بیوی دور دور بستے ہوں مگر وہ ان ضروری نکاح والوں کی بنائی ہوئی احمقوں کی جنت کی بجائے اللہ کی بنائی ہوئی جنت الماوی میں رہتے ہیں۔

جنت الماوی سورۃ نجم میں مذکور ہے اور یہ ایسے پر سکون مقام کو کہتے ہیں جہاں شعور بلندی کی طرف مائل ہو۔

ہمارا ضمیر

ایک دفتر میں رات کے وقت سکیورٹی گارڈ کی ڈیوٹی تھی کہ اس نے ساری رات جاگنا ہے، کیمرہ کے سامنے بیٹھنا ہے تاکہ ثبوت رہے کہ وہ جاگتا رہا ہے۔

رات جاگنے کے لیے گارڈ کو اجازت تھی کہ وہ دفتر میں لگی ہوئی بڑی سکرین پر کوئی بھی فلم، ڈرامہ یا خبریں دیکھتا رہے۔

اس سب کے باوجود وہ رات کو سو جاتا تھا۔ کیمرہ میں اس کی یہ حرکت نظر آجاتی اور اس کو بار بار وارننگ مل چکی تھی۔ آخر کار اس کے نہ سدھرنے کی وجہ سے اس کا معاملہ سیکورٹی افسران کی میٹنگ میں پیش کیا گیا۔ اس میں تمام وارننگ خطوط، سٹاف کے بیانات اور کیمرہ کی ریکارڈنگ بھی پیش کی گئی تاکہ فیصلہ میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔

کافی دیر تک تبادلہ خیالات کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اب اس گارڈ کو نوکری سے نکال دینا چاہیے بجائے اس کے کہ کوئی حادثہ ہو جائے اور بڑا نقصان رونما ہو۔ یوں اسے نوکری سے نکالنے کے لیٹر پر سب نے

دستخط کیے اور اس کو فارغ کر دیا گیا۔

اس مشکل فیصلہ سے فارغ ہو کر سب افسران بیٹھے چائے کے دوران ہنسی مذاق کر رہے تھے کہ ایک افسر نے دوسرے سے پوچھا کہ یہ گارڈ جو بار بار منع کرنے کے باوجود سو جاتا تھا حالانکہ اسے معلوم بھی تھا کہ کیمرہ کی آنکھ بھی اسے دیکھ رہی ہے اس کا نام کیا تھا؟

دوسرے افسر نے جواب دیا اس کا نام ضمیر تھا۔

اس ہنسی مذاق کے ماحول میں ایک بار پھر گہرا اور سنجیدہ سناٹا چھا گیا۔

دل کا راستہ

آپ کسی سے کہیں کہ اب فلاں کام نہ کرنا یا آپ کسی سے
کہیں کہ آج سے فلاں کام کرنا

سائیکالوجی کے مطابق ان دونوں جملوں کا اثر 50 فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا، یا تو 50 فیصد لوگ آپ کی بات نہیں مانیں گے یا لوگ آپ کی 50 فیصد باتیں نہیں مانیں گے۔

اب آپ کسی کا ہاتھ تھام کر اس کی آنکھوں میں پیار سے دیکھتے ہوئے یہی بات کہیں کہ فلاں کام نہ کرنا یا فلاں کام کرنا، سائیکالوجی کے مطابق نتیجہ 90 فیصد سے زیادہ نکلے گا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

خالی جملے دماغ کے عمومی حصے کا حصہ بنتے ہیں جہاں آپ کی کہی ہوئی بات کے علاوہ 14 باتیں اور بھی موجود ہوتی ہیں اور شور مچا رہی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے یہ ایک بات 50 فیصد سے زیادہ قابل عمل بن ہی نہیں پاتی۔

جب ہاتھ اور آنکھ کا لمس ہوتا ہے اور کان سے آواز دماغ تک پہنچتی ہے تو انسانی جسم دماغ کے اس حصے کو Activate کرتا ہے جس میں صرف تین ضروری کام، لوگ، خواب یا ارادے رکھے جا سکتے ہیں یوں آپ کی

بات دماغ کے اس VIP حصے میں چلی جاتی ہے جو 15 باتوں والے حصے کو VITO کرتا ہے۔

کبھی بھی ضروری بات یا پیغام راہ چلتے، فون پر، میسج پر، یا کسی ایسی جگہ بیٹھے جہاں دونوں ایک سمت میں دیکھ رہے ہوں، ہر گز نہ دیں، وہ بات یا پیغام کتنا بھی اہم کیوں نہ ہو، وہ دوسرے انسان کے دماغ میں اہمیت کا حامل نہیں بن پائے گا۔

اللہ قرآن میں فرماتا ہے جانور وہ ہیں جن کے کان تو ہیں مگر سنتے نہیں، آنکھیں تو ہیں مگر دیکھتے نہیں اور ان دونوں کی وجہ سے آگے فرماتا ہے دل تو ہیں مگر سمجھتے نہیں یعنی سمجھنے کا سننے اور دیکھنے سے بہت گہرا تعلق ہے۔

دل کو سمجھانا ہے تو آنکھوں، کانوں اور ہاتھوں کا راستہ مت بھولیے۔

قلب سلیم

انسانی نفسیات اور شعور کی ترقی کی ابتدا تب ہوتی ہے جب انسان چھوٹی چیزوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے باہر آ جاتا ہے۔

اس کی مثال اپنی زندگی میں چھوٹی، عام چیزوں کو بالائے طاق رکھ دینا، آگے بڑھ جانا اور دوسروں کی زندگی میں بغیر بلائے دخل اندازی۔

اس طرح کی چیزوں سے باہر آنے کا مطلب ہے کہ آپ کے شعور کی ترقی کی ابتدا ہو چکی ہے۔

آگے چل کر اسی تبدیلی کی وجہ سے آپ کی زندگی سے چھوٹے ظرف اور چھوٹی سوچ والے لوگوں کا انخلاء شروع ہو جاتا ہے اگرچہ آپ کو لگتا ہے آپ دن بدن تنہا ہو رہے ہیں مگر در اصل آپ شعور کے ڈرائنگ روم سے پرانے فرنیچر کو نکال رہے ہیں تاکہ نئے فرنیچر کے لیے مناسب جگہ بن سکے۔ یہ تبدیلی آپ سے زیادہ آپ کے ارد گرد کے افراد کو محسوس ہوتی ہے اور وہ آپ کو اسی دلدل میں واپس کھینچنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں اور اگر آپ استقامت پسند ہیں تو آپ ان لوگوں کے داؤ سے بچنے کے لیے ان سے مزید دور ہو جاتے ہیں۔

ممکن ہے شعور کے اس مقام پر بیٹھے لوگوں کو مغرور، بے وفا، بے ادب یا مرتد جیسے الفاظ سے پکارا جا رہا ہو مگر یہ الفاظ بھی مزید استقامت

کا باعث بنتے ہیں جیسا کہ بقول شاعر

"یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے"

اس سے اگلی اڑان میں انسان کے پر کھل جاتے ہیں، اس کا ڈر ختم ہو جاتا ہے، وہ معاشرتی و مذہبی رسومات سے مکمل اور معاشی لوازمات سے حد درجہ آزادی حاصل کر لیتا ہے یہاں انسان کا شعور اس کی سوچ کو مکمل پرکھنے سمجھنے، آزمانے اور بار بار آزماکر کامیابی قرار دینے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔

شعور کے اس مقام کو قرآن میں قلب سلیم کہا گیا ہے سورۃ شوری میں ارشاد ہے

اِلَّا مَنۡ اَتَى اللّٰهَ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍؕ 26:89

مفہوم: اللہ کے نزدیک جنتی وہ ہیں جو معاشرتی و مذہبی رسومات سے مکمل اور معاشی ضروریات سے مناسب بے نیازی کے ساتھ شعور کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے، عمل کرنے اور قلب سلیم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

انسان معاشرتی جانور ہے

یہ جملہ اس لیے بولا جاتا ہے کہ انسان جانداروں کی وہ قسم ہے جو معاشرہ بنا کر رہتا ہے۔
ویسے تو چیونٹیاں، شہد کی مکھیاں، پینگوئن اور بھیڑیا بھی معاشرتی جاندار ہیں مگر انسان، انسانوں میں زیادہ مشہور ہے۔
انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان جانوروں سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔
چھوٹی سی چیونٹی پر غور کریں اللہ نے اس کے اندر پوری کائنات چھپا رکھی ہے۔ ایک چیونٹی اپنے سے دس گنا بڑا کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، چیونٹی خود زراعت جانتی ہے، برے وقت کے لیے الگ خوراک کا بندوبست کرتی ہے ہر طرح کی خوراک کو الگ الگ طریقے سے محفوظ کرنا جانتی ہے اور انسانوں سے ہزاروں سال قبل یہ اپنی خوراک پر expiry date لگا کر سنبھال کر رکھتی اور اسی مناسبت سے استعمال کرنا جانتی تھی۔ یہ سب کچھ وہ اس لیے بھی کر پاتی ہے کیونکہ اس کے کان نہیں ہوتے یعنی اس نے زندگی میں کبھی یہ نہیں سنا ہوتا کہ تم فلاں کام نہیں کر سکتے، یہ تمھارے بس کی بات نہیں۔
چالاکی انسان کی ایک اور صفت ہے اور یہی صفت لومڑی میں بھی بکثرت پائی جاتی ہے یہ فیصلہ ابھی عدالت میں التوا کا شکار ہے کہ یہ صفت انسان

نے لومڑی سے سیکھی ہے یا لومڑی نے انسان سے۔ ایک اور نقطہ یہ بھی قابل غور ہے کہ کسی نے آج تک لومڑ کو چالاک نہیں کہا ہمیشہ لومڑی کو ہی چالاک کہا گیا ہے۔

پینگوئن اپنے پارٹنر کے ساتھ دوسری شراکت برداشت نہیں کرتا، اسی پارٹنر کے ساتھ رہتا، کھیلتا اور اپنا خاندان مکمل کرتا ہے۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ پینگوئن کی مادہ انڈے دینے کے بعد اپنے نر کو انڈوں پر بٹھا دیتی ہے اور خود باہر کے سب کام سنبھال لیتی ہے یوں یہ دونوں مل کر اس تصور کا خاتمہ کر دیتے ہیں کہ بچے صرف عورتیں سنبھالتی ہیں اور بیرونی معاملات صرف مرد جبکہ انسانوں کے بہت سے معاشرے ابھی تک اس شعور کو حاصل نہیں کر پائے اور کچھ تو ابھی تک اس کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں ۔

شہد کی مکھیوں کی ملکہ اپنے قبیلے کے سب سے مضبوط اور سمجھدار نر کا انتخاب کرتی ہے اور اپنی نسل اسی نر کے ذریعے آگے بڑھاتی ہے۔ اس کے لیے وہ آسمان کی جانب اڑان لیتی ہے، سب اس کا پیچھا کرتے ہیں جو اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے وہی اس قبیلے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ یوں شہد کی مکھیوں نے ہزاروں سال سے اعلان کر رکھا ہے کہ عورت کے پاس اپنا مرد چننے کا اختیار ہے، انسانوں میں چند سو سالوں پہلے تک بھی یہ عیب سمجھا جاتا تھا اور ہمارا ایشیا تو ابھی تک اس معاملے میں غاروں

کے دور سے گزر رہا ہے۔
چمگادڑ واحد Mammal جاندار ہے جو انسانوں کی طرح انڈوں کی بجائے بچے پیدا کرتی ہے اور ہوا میں بھی اڑتی ہے۔ یعنی بچے پیدا کرنے کا ہر گز یہ مطلب نہ لیا جائے کہ کوئی آپ کی اڑان پر پابندی لگا سکتا ہے۔

آپ نے Star Fish دیکھی ہو گی اس کی جسامت بالکل ستارے کی طرح ہوتی ہے اس لیے اسے Star Fish کہتے ہیں۔ یہ مچھلی ساری زندگی ایک جیسے پانی میں، ایک جیسے حالات میں، ایک جیسی خوراک اور ایک جیسے ماحول میں زندہ رہتی ہے، یہ اپنا ماحول بدلنا ہی نہیں چاہتی نہ اس کے لیے کوئی کوشش کرتی ہے، بات یہ ہے کہ Star Fish وہ جاندار ہے جس میں دماغ نہیں ہوتا۔
پس ثابت ہوا کہ اپنا ماحول اور اپنی زندگی نہ بدلنے کی بنیادی وجہ دماغ کا نہ ہونا ہے۔ انسانوں میں بھی Star Fish کی اکثریت دیکھی جا سکتی ہے۔

مجھے لگتا ہے جب میں ایک معاشرتی جاندار ہو کر انسانی معاشرے کو جانوروں سے مماثلت دینے کے بارے میں لکھ رہا ہوں تب انھی معاشرتی جانداروں میں سے بھی کوئی اپنے جیسوں کو انسانوں کے بارے بتانے میں مصروف ہو گا۔

آپ میری باتوں پر ضرور ہنس سکتے ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر ایک دفعہ غور کرنے کی گزارش ضرور کروں گا۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رنگوں کا بادشاہ

سائنس کہتی ہے رنگ بذات خود کوئی شے نہیں ہوتی، یہ انسانی آنکھ میں لگے عدسوں کا کمال ہے جو شعاؤں کے ذریعے رنگوں میں تفریق کر کے ہمارے دماغ کو منتقل کرتے ہیں۔

رنگوں کا اندھا پن بھی اسی نظام کی کسی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو رنگوں کے اندھے پن (color blind) کی بیماری ہوتی ہے۔

سائینسی رنگ کے بعد ایک اور اہم رنگ ہے جسے "رنگ" دکھانا کہتے ہیں۔ اگر کوئی انسان دولت، طاقت، اختیار یا عزت ملنے کے بعد اپنے اصول، اپنے قاعدے یا رویے میں منفی تبدیلی لائے تو کہا جاتا ہے کہ "رنگ" دکھا رہا ہے۔

اور اگر وہ اپنی اصل کو ہلکا یا پست سمجھنا شروع کر دے تو کہا جاتا ہے "رنگ" بدل رہا ہے۔ گرگٹ کے رنگ بدلنے کی صلاحیت کو ہمارے ہاں خوب منفی انداز میں مزے لے کر اسی انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔

عاشق مزاج لوگوں میں بھی "رنگ" کا عجب استعمال ہے، یہ ایک جیسے رنگ دیکھنا، پسند کرنا اور پہننا بھی پسند کرتے ہیں۔ یہ اپنے محبوب کو جس رنگ میں دیکھ لیں وہی پسندیدہ رنگ بن جاتا ہے۔ وہی رنگ کمزوری بن جاتا ہے اور وہی سب سے بڑی طاقت بھی، اداسی میں اسی

رنگ کو دیکھ کر روتے ہیں اور اسی رنگ کو دیکھ کر نہایت طاقتور بن جاتے ہیں۔

پھر ایک رنگ وہ ہوتا ہے جسے "رنگ" میں ڈھلنا کہتے ہیں انسان جب کسی نئ تہذیب، نئ عادات، نئے طور طریقوں کو اپناتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اب وہ "رنگ" میں ڈھل رہا ہے۔

روحانیت کی کتابوں میں رنگ کو اپنے مرشد جیسا بننے کے معنوں میں لیا جاتا ہے اور جو اس رنگ میں جتنا رنگ جاتا ہے وہ اتنی ہی رموز سے آشنا ہو جاتا ہے۔

انسان کبھی کوئی اچھی کتاب پڑھتا ہے تو اس کے رنگ میں ڈھلنے کی کوشش کرتا ہے یا کبھی کوئی شخصیت انسان کو اپنی جانب ایسے کھینچتی ہے کہ انسان اس جیسا بننے کے لئے اس کا رنگ اختیار کرتا جاتا ہے مگر ان سب رنگوں سے بلند و بالا وہ رنگ ہے جسے کائنات کے خالق نے صبغۃ اللہ بیان فرمایا ہے۔ صبغہ عربی زبان میں اس رنگ کو کہتے ہیں جس میں کوئی شے مکمل طور پر رنگ سکے۔ جیسا کہ ایک سفید رنگ کے پیالے کو ایک لال رنگ کے پینٹ کے ڈبے میں اچھی طرح ڈبو کر نکالا جائے تو وہ پیالہ لال رنگ میں ڈھل چکا ہوگا اور اسکی سفیدی کا نام و نشان تک بھی باقی نہ رہے گا۔

اور اس سے اگلے جملے میں خالق کائنات فرماتا ہے

وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً

ترجمہ: اور اللہ سے بہتر رنگ کون سا ہو سکتا ہے ۔

یعنی اللہ فرما رہا تھا کہ اگر تم نے ڈھلنا ہی ہے تو اللہ کی تعلیمات میں ڈھلنے سے بہتر کوئی شے نہیں ہے۔ اور صبغہ کا لفظ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ وہی رنگ ہے جس میں انسان مکمل طور پر ڈھل سکتا ہے۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ابلیس اور عمل الصالحات

میں نے شاید پہلے بھی لکھا تھا کہ سائیکالوجی کے مطابق عام انسان 75 فیصد دماغ ماضی میں ہونے والے واقعات کو یاد کرنے اور دہرانے میں لگائے رکھتا ہے اور زیادہ تر افراد اس سے آزردگی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کر پاتے۔

بیس فیصد دماغ مستقبل کے خیالی پلاؤ پکانے یا مستقبل میں پیش آنے والے ممکنہ خطرات کے بارے میں سوچنے پر گزار دیتا ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ خوف کسے کہتے ہیں؟

خوف اس صورتحال کو کہتے ہیں جس میں انسان کو مستقبل حال سے برا نظر آئے۔

عام مثال ہے کہ اگر ایک انسان نوکری کرتا ہے اس سے اپنا گزر بسر کرتا ہے اور اسے اچانک خبر ملے کہ اس کی کمپنی بند ہونے والی ہے تو ایسا انسان معاشی خوف کا شکار ہو جائے گا یعنی اسے نظر آئے گا کہ جو پیسہ اسے آج مل رہا ہے اور اسکے اخراجات پورے ہو رہے ہیں وہ مستقبل میں میسر نہیں ہوگا۔

دوسری مثال یہ ہے کہ انسان سے ایک سانپ کا سامنا ہو جاتا ہے تو انسان پر خوف کیوں طاری ہو جاتا ہے کیونکہ اسے لگتا ہے یا تو وہ شدید تکلیف میں ہوگا یا مر جائے گا چونکہ نہ وہ ابھی تکلیف سے مرا ہے اس لیے مستقبل میں کچھ برا ہوتا نظر آرہا ہے اور اسی حالت کو خوف کہتے ہیں۔

دنیا میں وہ افراد جن کی موت سانپ کے ڈسنے سے ہوتی ہے ان میں سے 80 فیصد افراد سانپ کے زہر کی بجائے اس خوف سے مر جاتے ہیں کہ انھیں سانپ نے ڈس لیا ہے اسی خوف سے ان کو ہارٹ اٹیک ہوتا ہے اور ان کی موت ایک منٹ کے اندر ہی دل کے بند ہونے کی وجہ سے ہو جاتی ہے جبکہ زہر کو موت تک جانے میں کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ تحقیق تو یہ بھی بتاتی ہے کہ سانپوں کی اکثریت میں اتنا زہر ہی نہیں ہوتا کہ ان سے انسان کی موت واقع ہو سکے مگر انسان ان سانپوں کے ڈسنے سے بھی مر جاتے ہیں کیونکہ وجہ وہی خوف سے دل کا بند ہونا ہے نہ کہ زہر۔

ایک تیسری مثال ماضی سے لے سکتے ہیں جس میں انسان نے اگر ماضی میں کوئی گناہ، چوری یا غلطی کی ہے جو ابھی کسی کو معلوم نہیں تو

ایسا انسان بھی خوف کا شکار ہوگا کیونکہ وہ یہ سوچتا رہتا ہے کہ اس کا مستقبل اس کے حال سے برا ہو جائے گا۔

سائیکالوجی کی تحقیق بتاتی ہے کہ خوف پر قابو پانے کا سب سے آزمودہ طریقہ یہ ہے کہ انسان حال میں جینا شروع کرے۔ حال اس حالت کو کہتے ہیں جس میں نہ ماضی ہو نہ مستقبل، صرف حال ہو، حال ایسا حال ہے جس میں نہ ماضی کی تلخ یادیں ہیں اور نہ مستقبل کا کوئی خوف۔

ہم ماضی میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے مگر ماضی ہمارے حال کو بے سکون کر کے تبدیلی لاتا رہتا ہے ، اسی طرح جو مستقبل کا خوف ہمیں پریشان رکھتا ہے اس کے بارے میں اول تو یہ یقین ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ رونما ہو گا بھی یا نہیں، اگر رونما ہوگا تو اثر انداز ہوگا یا نہیں اور یہ یقین کہاں سے لایا جائے کہ اس خوفناک مستقبل کے دور میں ہم بھی ہونگے یا نہیں؟

اگر ماضی کو بدلا نہیں جا سکتا اور مستقبل کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی تو ان چیزوں کے بارے میں فکرمند ہونا صرف ایک خود ساختہ سوچ اور

اس سے پیدا ہونے والا خوف ہے یہ خوف انسان کو موت تو نہیں دے پاتا مگر اس انسان میں پیدا ہونے والے مثبت جذبات، موٹیویشن اور خود اعتمادی کی موت ضرور بن جاتا ہے اس سے نجات کا آسان حل یہ کہ جب بھی ایسے خیالات کا وار ہو تو خود کو حال میں واپس لے آئیں اور سوچیں کہ اس وقت آپ کا سب سے ضروری کام کیا ہے، آج آپ کو اور کیا کیا کرنا، دیکھنا، پڑھنا اور سوچنا ہے، اپنے لیے روزانہ کے ٹارگٹ طے کریں اور دن کے مختلف فارغ اوقات میں ان چھوٹے چھوٹے ٹارگٹ کو پورا کریں تاکہ آپ کو فتح کا احساس ہو اور خود اعتمادی بحال ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ماضی اور مستقبل سے پیدا شدہ منفی اثرات کے ابلیس کو حال کے عمل الصالحات سے شکست دیں۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دھن پرایا اور بیٹیاں اپنی ہوتی ہیں

ضروری نہیں ہے کہ ہر روایتی جملہ کوئی آفاقی حقیقت ہوتا ہے۔

کچھ جملے غلط ہیں، سو فیصد غلط۔
جیسا کہ ”بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں“ ۔

یہ جملہ کوئی کہہ سکتا ہے؟

اتنا حوصلہ آ جاتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جب گھر کی تعمیر ہوتی ہے تو کمروں کا حساب بیٹوں کی تعداد سے لگایا جاتا ہے، بیٹی کا اگر کمرہ ہو بھی تو وہ اسکی شادی کے بعد چھوٹے بھائی کو مل جاتا ہے۔

جب وہ آتی ہے تو اپنے ہی گھر میں ”ایڈجسٹ“ ہوتی ہے، بچے کسی کمرے میں اور خود کسی دوسرے کمرے میں۔

جیسے بیٹا شادی کے بعد اپنے گھر میں رہتا ہے، ایسے ہی بیٹی کا حق ہے کہ وہ شادی کے بعد جب بھی آئے، اپنے کمرے میں رہے۔

کیونکہ ''بیٹیاں پرایا دھن ہر گز نہیں ہوتیں''۔ اسے اس خوف سے نجات دلائیں کہ شادی کے بعد چار کاندھوں پہ واپس آنے کا آپشن ہے۔
اسے یقین دلائیں کہ خدانخواستہ شوہر نکما ہو اور مار پیٹ کرے تو باپ اور بھائی پورے معاشرے کو جوتے کی نوک پر رکھ کر تمہیں زندہ دیکھنے کی خواہش میں گھر کی دہلیز پہ اپنی باہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔

میرے ذاتی خیال میں دھن پرایا اور بیٹیاں اپنی ہوتی ہیں۔

محبت صرف ایک سے ہوتی ہے

جب ہمارے تعلقات میں کوئی مضبوطی نہیں رہ جاتی اور ہم اپنے اندر کوئی ایسی صلاحیت بھی پیدا نہیں کر پاتے جو محبوب کو ہم سے جوڑے رکھے تب یہ محاورہ استعمال کر کے محبوب کو قید رکھنے کی آخری کوشش کی جاتی ہے جو کافی حد تک کارگر ثابت ہوتی ہے۔

مجھے تم سے محبت ہے I love you

آپ اس جملے پر غور کریں زبان کے تمام اصولوں کے اعتبار سے یہ ایک جملہ اظہار ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں مجھے بھولنے کی عادت ہے۔ یہ جملہ کہیں سے بھی سوالیہ نہیں ہے مگر سو فیصد افراد I love you کو سوالیہ جملہ سمجھتے اور بولتے ہیں اور باقاعدہ انتظار کیا جاتا ہے اس کا ایسا ہی جواب سننے کا۔

میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا/سکتی

سائیکالوجی کے ذریعے باقاعدہ کھدائی کر کے معلوم کیا گیا ہے کہ اس جملے کا اصل متن جو دل سے نکلتا ہے وہ یہ ہوتا ہے ”پلیز تم میرے بغیر نہ رہنا“ مگر عقل اور زبان کے استعمال سے اس آہ کو بدل کر پیش کر دیا

جاتا ہے تاکہ سننے والے کو اچھا محسوس ہو۔

میں اپنا دودھ نہیں بخشوں گی

عورت جب اولاد کی مناسب تربیت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے اور بچے پنجرے سے پر پھیلائے اپنی اڑان اڑنے لگتے ہیں تو آخری حربہ کے طور پر دودھ نہ بخشنے کی دھمکی آجاتی ہے۔ ماں اس جملے سے یہ اظہار کرتی ہے میری تربیت میں کمی تھی وگرنہ تمام تعلیمات کے مطابق دودھ کوئی قرض یا گناہ نہیں ہے جو بچہ دو سال کی عمر میں کر کے آیا ہوا ہو۔ اب نیا مسئلہ یہ ہوگا کہ ڈبوں کا دودھ پلانے والی مائیں کیا کہا کریں گی؟

نفسیاتی طور پر انسان جو اصل میں سوچتا ہے اسے بولتا نہیں ہے، جو کچھ وہ بولتا ہے وہ ایک لفافہ ہوتا ہے جس میں اصل سوچ اندر کہیں چھپی ہوتی ہے اور باہر وہ لکھا ہوتا ہے جو سارے ڈر، خوف، لحاظ محبت، مروت ڈال کر ایک جملہ بنتا ہے۔

اسی ایک انسان کے جملے اور اسکی سوچ میں اکثر تو اتنا بھی فاصلہ ہوتا ہے جتنا دو مختلف انسانوں کی سوچ میں۔

ہم سب سفر میں ہیں

جسمانی، شعوری، ذاتی یا نفسیاتی مگر ہم سب سفر میں ہیں

کچھ سفر ایسے ہوتے ہیں جس میں انسان کو سفر محسوس ہو رہا ہوتا ہے جیسا کہ بس، ٹرین، جہاز وغیرہ کا سفر، انسان شعوری طور پر بھی ایسے سفر کرتا ہے جسے وہ محسوس کررہا ہوتا ہے۔

محبت کی غیر موجودگی سے محبت کی موجودگی کا سفر

جب انسان کو محبت ہوتی ہے تو اس سفر کو محسوس کرتا ہے، یہ تبدیلی اس کے دن رات بدل کے رکھ دیتی ہے۔ وہ، وہ کرنا شروع کردیتا ہے جو پہلے صرف سوچتا، سنتا یا دیکھتا تھا۔

نفرت بھی ایسا ہی ایک سفر ہے، اس میں بھی انسان وہ سب کررہا ہوتا ہے جو پہلے اس نے صرف کبھی سنا، سوچا یا دیکھا تھا اور شاید اسے اچھا بھی نہیں جانا تھا۔

حسد بھی ایسا ہی جذبوں کا سفر ہے۔

پھر کچھ سفر ایسے ہیں جو انسان کو عام طور پر محسوس نہیں ہوتے، اس کی عام مثال ہے کہ آپ ایک کرسی پر بیٹھ جائیں، وہ کرسی زمین پر ہے اور ہم جانتے ہیں زمین تقریباً ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے مگر ہمیں محسوس نہیں ہو رہا۔ یعنی ہمارے محسوسات اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ ہم سفر میں ہیں۔ ہم محسوس کریں یا نہ کریں سفر جاری رہتا ہے۔

اس کی دوسری مثال عمر کا سفر ہے، ہر سیکنڈ، منٹ ، گھنٹہ، دن، ہفتے اور مہینے بھی سفر ہیں مگر ہمیں محسوس نہیں ہوتا۔

ہمارے بال اور ناخن ہر لمحہ بڑھ رہے ہوتے ہیں، ان کا یہ سفر بھی ہمیں روزانہ محسوس نہیں ہوتا مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ سفر میں ہیں۔

سفر پھر بھی جاری رہتا ہے، ہاں مدت بعد ضرور محسوس ہوجاتا ہے جیسا کہ بقول ناصر بشیر صاحب

سورج کے ڈوبنے پہ نہ حیراں ہوئے کبھی
اب سوچتے ہیں کتنے کیلنڈر بدل گئے

ایک سفر ایسا ہے جو سفر کرنے والے کو محسوس ہو یا نہ ہو، اس کے ارد گرد کے افراد کو فوراً محسوس ہو جاتا ہے بلکہ ایسا کہنا چاہیے کہ وہ محسوس ہی کر جاتے ہیں۔

اس سفر کو شعور کا سفر کہتے ہیں، اس سفر کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں

کبھی یہ سفر جہالت سے علم کی طرف ہوتا ہے، کبھی غلط ماحول سے انسان دوست ماحول کی طرف، کبھی غلط انسان سے صحیح انسان کی طرف، کبھی خالی باتوں سے لیکر دلی محسوسات تک اور کبھی روایات سے احکامات کی جانب، سب سفر ہیں ، ہمیں محسوس نہیں ہوتے، مگر یہ سفر جاری رہتے ہیں۔

ناصر بشیر اسی میں آگے لکھتے ہیں
پہلے سے خدو خال ہیں نہ پہلے سے ہیں خیال
کتنے ہم ایک سال کے اندر بدل گئے

قرآن کی یہ آیت آج بھی مجھے اتنا ہی متحیر کرتی جتنا پہلی بار کی تھی آیت کا مفہوم ہے

"تم سفر کرو، ہم تمھیں نشانیاں دکھائیں گے"

انسانی نفسیات کے عجائب

انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جو اپنے بالوں کو رنگ لگاتا ہے وہ اپنی باتوں کو بھی رنگ لگاتا ہے، اصلی بالوں کو نقلی رنگ لگا کر دکھانے والوں کی اکثریت اصلی باتوں کو بھی نقلی رنگ لگا کر پیش کرتی ہے۔

سائیکالوجی کا مطالعہ سکھاتا ہے کہ انسان جس بھی عادت، بات یا شخصیت کو 66 دن قائم رکھے وہ اس کے مزاج میں ڈھل جاتی ہے اور ایسی تمام چیزوں کو چھوڑتے وقت انسان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اپنی غلطی پر شرمندہ ہو جانا ایک ایسی خوبی ہے کہ جو انسان شرمندہ ہوتا ہے، شرمندگی کو سمجھتا ہے وہ انسان اپنے ارد گرد کے لوگوں کو بہتر سمجھتا بھی ہے اور ان کا بہتر خیال بھی رکھ پاتا ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ جس شخص سے آپ محبت کرتے ہیں اس کی سب تفصیلات کو آپ کیوں جان پاتے ہیں جیسا کہ اس کے چہرے پر ایک چھوٹا سا دانہ، تل، یا اسکے بالوں میں ایک سفید بال، یا اسکا کوئی زیور، اس کے ہاتھوں پر کوئی نیا نشان، اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں کوئی تبدیلی، اس کے لباس میں کچھ نیا، اس کی آنکھوں کا رنگ، اتنا سب آپ کیسے جانتے ہیں جبکہ باقی انسانوں کو بھی آپ کی نظر دیکھتی ضرور ہے مگر یہ

سب تفصیلات نظر انداز ہو جاتی ہیں، عام طور پر اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ محبت ہے مگر حیران کن طور پر اس کی ایک سائنسی وجہ بھی ہے۔ انسان جب بھی اپنی پسند کی شخصیت کو دیکھتا ہے تو دیکھنے والے کی آنکھیں عام حالت سے 45 فیصد زیادہ کھلتی ہیں، دیکھنے والے کی پلکیں 45 فیصد سے زائد کے زاویے پر کھل جاتی ہیں یہ تقریبا دو گنا کے برابر ہے پس انسان اپنے پسندیدہ انسان کو دوگنی طاقت سے دیکھتا ہے۔ یہی وہ وجہ ہے جس سے محبوب کی زیادہ تفصیلات ہمارے دماغ تک رسائی حاصل کرتی ہیں۔ اور اگر کسی کی نہیں کر رہی تو؟

جواب آپ جانتے ہیں۔

اور آخر میں بتاتا چلوں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جھگڑے یا اختلاف کے وقت آپ کسی انسان کی اچھائیاں نہیں یاد رکھ پاتے اور اس وجہ سے جھگڑے کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے اور جھگڑا طول اختیار کر لیتا ہے۔ سائیکالوجی کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان جب ایک منفی بات یا خیال سنتا یا سوچتا ہے تو ہمارے دماغ سے فوراً 5 مثبت باتیں یا یادیں غائب ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک منفی خیال کسی مثبت انسان کے بارے میں ہمارے خیالات بدلنے کے لیے کافی رہتا ہے۔ اس ایک خیال کو تھوڑی سی توجہ سے ہم نگہداشت کر کے جلد ہی بیج سے درخت بنا لیتے

ہیں اور پھر یہ درخت پھل دینا شروع کر دیتا ہے اور اس کے پھل سے مزید درخت آگ پڑتے ہیں اور یوں یہ منفی خیالات کا جنگل انسانی نفسیات کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کردیتا ہے جہاں نہ اسے کچھ اچھا دکھائی دیتا ہے، نہ سنائی دیتا ہے نہ سمجھ آتا ہے، غالباً اسی درخت کے پاس جانے سے آدم یعنی آدمیت کو منع کیا گیا تھا، یہی وہ مقام ہے جسے قرآن میں جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ

اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ

ترجمہ: اُن کے لیے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کے لیے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اور اُن کے لیے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں، یہ لوگ جانوروں جیسے ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں، یہی لوگ غافل ہیں۔

سائیکالوجی اور بائیولوجی کا چولی دامن کا ساتھ ہے

بائیولوجیکل مسائل کا حل سائیکالوجی کے ذریعے بہت حد تک ممکن ہے اور اس پر کام بھی کیا جا رہا ہے اور کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

ہپناٹزم کے ذریعے مریض کے دماغ کو سلا کر اس کے جسم پر انجکشن اور کٹ لگانے کا تجربہ بھی کامیابی کے مراحل میں ہے۔ یوں یہ فنون جن کو لوگ جوگیوں، صوفیوں اور عاملوں کے پاس تلاش کرتے تھے جلد یہ یونیورسٹیز میں پڑھائے جائیں گے اور ان میں ڈپلومہ ، ماسٹرز یا PhD کی ڈگری ملا کرے گی۔

ٹیکنالوجی پہلے ہی سے انسان کی سائیکالوجی کو سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو ڈھال رہی ہے، Home Automation میں یہ کام پہلے سے ہو چکا ہے کہ انسان جب صبح اٹھتا ہے تو کیسی روشنی پسند کرتا، کیسے الارم ہونے چاہیے دیواروں اور پردوں کا رنگ کیسا بھلا لگتا ہے یہ سب کچھ کیا جا چکا ہے اور اس میں مزید بہتری لائی جا رہی ہے۔ انھی اصولوں پر شام اور رات کا ماحول بھی گھر کے اندر لگی مشینری انسان کے موڈ کے حساب سے بدلتی ہے۔

مزید دیکھیے کہ کسی بات کا اچھا یا برا لگنا ایک سائیکالوجیکل مسئلہ ہے اور انسان کی آنکھ سے پانی، الیکٹرولائیٹ اور پروٹین کا ایک ساتھ باہر نکلنا جسے

ہم عام زبان میں آنسو کہتے ہیں، یہ ایک بائیولوجیکل پروسیس ہے مگر آپ غور کریں کس طرح اللہ کے کمال تخلیق نے بائیولوجی کو سائیکالوجی سے جوڑ کر رکھا ہے۔ جہاں ایک بری بات یا جملہ انسان کے کانوں کے ذریعے دماغ تک پہنچتا ہے، دماغ فوراً پانی، الیکٹرولائیٹ اور پروٹین یعنی آنسوؤں کو حکم دیتا ہے کہ نکل جاؤ تاکہ بولنے والا دیکھ کر شاید رک جائے اور مزید سائیکالوجیکل نقصان نہ ہو۔

خوشی کے آنسو بھی ایسے ہی کسی جملے، عمل یا منظر کے محتاج ہوتے ہیں، بس انسان کی سائیکالوجی پر ایک مثبت ضرب لگنے کی دیر ہے، پانی، الیکٹرولائیٹ اور پروٹین کا اجتماع دھرنہ دینے آنکھوں سے باہر نکل پڑتا ہے۔

ایک حیران کن تحقیق کے مطابق 99 فیصد افراد کے خوشی کے آنسو دائیں آنکھ سے پہلے نکلنا شروع ہوتے ہیں اور غم وتکلیف کے آنسو بائیں آنکھ سے پہلے باہر آتے ہیں۔

مجھے میرے گرو نے کہا تھا انسان کا راز اس کی آنکھوں میں ہے کیونکہ زبان سمیت پورا جسم جھوٹ بول سکتا ہے مگر آنکھیں ساتھ نہیں دیتیں تب سے مجھے ان موضوعات کی راکھ چھاننے کا شوق ہے اور اسی راکھ کو اڑاتا رہتا ہوں تاکہ وہ آپ تک پہنچ سکے ۔ باقی بقول غالب

"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"

ہمارا نبی، ہم اور تھوڑا سا نفسیاتی فرق۔۔۔

میں نے پڑھا اور سنا ہے کہ ہمارے نبی نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور میں نے اپنی 45 سالہ زندگی میں اپنے سمیت ایک بھی سچا انسان نہیں دیکھا اپنے ملک میں۔

ہمارے نبی کو قوموں اور قبیلوں کا رواج ہر گز پسند نہیں تھا اور اپنی ساری زندگی حتیٰ کہ آخری خطبہ میں بھی انھوں نے فرمایا کہ کسی بھی قوم کو کسی دوسری قوم پر کوئی فوقیت نہیں دی جا سکتی، ہم نے یہ پورا خطبہ محفوظ کر رکھا ہے اور ساتھ ہی نبی کے ہی قبیلے کو سارے قبیلوں سے افضل بنایا اور آج 2023 تک میں بھی اپنی قوم سے باہر شادی کرنا برا سمجھتے ہیں۔

میں نے پڑھا اور سنا ہے کہ ہمارے نبی کو جھگڑا بالکل نہیں بھاتا تھا، اتنا کہ دشمن جنگ کرنے بھی آیا تو میدان جنگ میں بھی صلح کا پیغام بھیجا اور پیغام رد ہو جانے کے باوجود بھی لڑائی میں پہل نہیں کی۔ لڑائی کے دوران بھی عورتوں، بزرگوں اور بچوں کو مستثنیٰ رکھا، امن کی حد تو یہ تھی کہ جانوروں اور درختوں کو بھی نقصان پہنچانے سے منع فرمایا۔

مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ ہمارے نبی کو کھانے میں سب سے زیادہ کیا پسند تھا میں عرض کرتا ہوں انسان کو جو سب سے زیادہ پسند ہو وہی اس کی خوراک میں سب سے زیادہ شامل ہوگا تو ہمارے نبی کو کھانے میں حلال پسند تھا کیونکہ انھوں نے اسے پوری زندگی کھایا۔

حلال کمائی کا سادہ سا نان اور حرام کمائی کا زعفران بھی برابر نہیں کہلا سکتے۔

حرام صرف چوری، ڈاکہ یا رشوت ہی نہیں ہے بلکہ ہر وہ کمائی جو دوسرے کے حلال کو مشکل بنا دے، حرام ہے۔

ہر وہ حلال کمائی جو کسی کو چوری، ڈاکہ یا رشوت لینے پر مجبور کر دے، حرام ہے۔

ہر وہ کمائی جو کسی کی عزت نفس کو پامال کرے، حرام ہے۔

بقول میاں محمد بخش رح

"بے شرمی دے حلوے نالوں ساگ سروں دا چنگا"

ہر وہ حلال جس سے ہمارا پیٹ تو بھر جائے مگر ہمارے ارد گرد کوئی بھوکا رہ جائے، حرام ہے۔

تو جناب عالی، ہمارے نبی نے کبھی حرام نہیں کمایا نہ کھایا اور میں آج تک ایک حلال کمانے والا ڈھونڈ رہا ہوں اور مجھے آئینے سمیت، کہیں بھی نظر نہیں آ رہا۔

ہمارے نبی کے خطبات جب اکٹھے کیے گئے تو پتہ چلا کہ سب سے لمبا خطبہ بھی آجکل کے وقت کے حساب سے 20 منٹ سے زیادہ کا نہیں ہے ہمارے کسی مولوی کا خطاب گھنٹے سے کم وقت میں نہیں ہوتا۔ جدید تحقیق بتاتی ہے کہ جتنا بھی اہم موضوع کیوں نہ ہو انسان کے اندر 20 منٹ کے بعد سننے کی صلاحیت جواب دینا شروع کر دیتی ہے۔

جس نبی کا نام لے کر ہم دوسروں کو مرتد، منافق یا کافر کہہ کر اس کے قتل کا فتویٰ دیتے ہیں اسی نبی نے اپنی زندگی میں اس شخص کی تدفین بھی خود سے فرمائی جسے رئیس المنافقین کا خطاب مل چکا تھا۔

ایک عجیب روایت ہے مگر کتابوں میں چونکہ ایسا ہی لکھا ہے تو میں

میں ایسا ہی پیش کروں گا کہ کسی شخص کو سنگسار کیا جا رہا تھا، وہ کسی طرح بھاگ نکلا تو ایک صحابی نے ٹانگ اڑا کر اسے گرا دیا اور آکر آنحضرت کو بتایا تو آپ نے فرمایا اگر وہ بھاگ رہا تھا تو اسے بھاگنے دینا تھا۔۔۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ اگر تمھیں دین کے معاملے اصل بات کا علم نہ ہو اور کوئی مسئلہ درپیش آ جائے تو اس رستے کا انتخاب کر لینا جو آسان ہو، آپ نے آسانیاں دینا پسند فرمایا۔

امن کی سوچ کا یہ عالم تھا کہ آپ نے فرمایا کہ خالی نیام کا رخ بھی کسی کی طرف نہ کرو۔

اگر نبی کے سب اقوال ایک جگہ اکٹھے کیے جائیں اور ان کو موضوع کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو جس موضوع پر سب سے زیادہ گفتگو فرمائی وہ استغفار ہے یعنی صرف اپنی خود احتسابی کرنا، صرف اپنے اعمال کی طرف توجہ رکھنا اور ان کی اصلاح کے لیے احکامات الٰہی کی پناہ میں رہنا۔

ہمارا سارا دھیان دوسروں کے اعمال کی طرف ہے۔

یاد رکھیے! جو صرف اپنے اعمال کی طرف دھیان رکھے گا وہ انسان کہلاتا ہے اور جسے دوسروں کے اعمال کی طرف دیکھنا اور ان کا احتساب کرنا ہے اسے "اللہ" کہتے ہیں ۔ ہمیں اللہ کا واسطہ ہے ہم انسان ہی رہیں تو ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مرد یہی کرتے ہیں

رینالہ خورد اوکاڑہ کے پاس ایک تحصیل ہے جہاں مجھے آج سے تقریباً تیس سال قبل ایک فوجی کالونی میں پانچ سال گزارنے کا اتفاق ہوا، روزانہ سکول، کالج اور بازار جاتے ہوئے راستے میں ایک نہر کا پل آتا تھا جو شہر سے رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ دن میں کم سے کم چار دفعہ اس پل سے گزرنا فرض تھا۔

اس پل پر نہری پانی کا بہاؤ بہتر بنانے کے لیے جھال تیار کی گئی تھی جو پل کے مشرقی طرف سے آنے والے پانی کو مغرب کی طرف 10 فٹ نیچے گراتی تھی اور یوں پانی کا بہاؤ مغرب کی طرف تیز ہو جاتا تھا اور اگلے علاقوں کو سیراب کرتا تھا۔ پل کی دائیں جانب ایک لوہے کی بڑی اور مضبوط جالی تھی جو ٹوٹ کر گرے ہوئے درختوں اور نہر میں پھینکی گئی غیر ضروری چیزوں کو روک لیتی تھی اور صرف پانی گزرتا رہتا تھا۔ محکمہ انہار کے ملازم ہر کچھ دن بعد دائیں طرف کی جالی میں پھنسی ہوئی چیزوں کو نکال دیتے تھے تاکہ پانی کا راستہ صاف اور بہاؤ تیز رہے۔

رینالہ خورد میں ان دنوں انگلستان سے ایک خط موصول ہوا جس میں

کسی کمپنی نے لکھا تھا کہ یہ پل ہم نے 1892 میں بنایا تھا جب یہاں انگریزوں کی حکومت تھی اور ہم نے سو سال کی گارنٹی دی تھی کہ یہ پل نہیں گرے گا۔ اگرچہ ہم 1947 کو ہندوستان میں اپنی کمپنی بند کر کے واپس انگلستان آ چکے ہیں مگر ہمارے ریکارڈ کے مطابق آج ہماری طرف سے دی گئی پل کی گارنٹی مکمل ہو گئی ہے آج کے بعد ہم اس پل کے لیے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔

یہ چھوٹا سا معمولی سا خط نہایت غیر معمولی پیغام دے گیا۔ قوم کے معیار کیا ہوتے ہیں اور ان معیارات کو نبھانے والے کتنا احساس ذمہ داری رکھتے ہیں، انسان کی زبان، اس کے الفاظ کتنے اہم ہوتے ہیں وہ یہ خط ہمیں چیخ چیخ کر بتا رہا تھا، نہ وہ کمپنی ہندوستان میں رہی، نہ وہ حکومت باقی رہی، نہ وہ لوگ زندہ رہے اور نہ ہمارے پاس کوئی ایسا ریکارڈ تھا کہ ہم ان پر کوئی دعویٰ کر سکتے پھر بھی کوئی انگلستان میں بیٹھا ہوا ایک شخص یہ ذمہ داری نبھاتا ہے اور اپنی آنے والی نسلوں کو پیغام دیتا ہے کہ قوم اپنے معیار پر فائدے اور نقصان سے بالاتر ہو کر عمل پیرا ہوا کرتی ہے۔

اسی پل سے گزرتے ہوئے ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ پل کی دائیں

جانب سے ایک لاش بہتی ہوئی آتی ہے اور لوہے کی جالیوں کے پاس آکر رک جاتی ہے کیونکہ اس سے آگے وہ جا نہیں سکتی۔ لاش ایک جوان لڑکی کی ہے جو شادی کے سرخ جوڑے میں ملبوس ہے اور زیور تک بھی نمایاں نظر آ رہا ہے۔ لاش سیدھی حالت میں ہے، بازو کھلے ہوئے ہیں، چہرہ آسمان کی طرف ہے اور کھلی ہوئی گول آنکھیں ایک جگہ ساکت ہیں۔ اسے دیکھ کر خوف سا طاری ہو جاتا ہے ویسے تو ہر دو تین ماہ بعد کوئی نہ کوئی لاش یہاں آ کر رکتی تھی اور محکمہ انہار والے اسی دن یا اگلے دن اسے ضرور نکال کر امانتاً دفنا دیتے تھے مگر دلہن کی لاش دیکھنے کا یہ خوفناک منظر میرا اور میرے جیسے بہت سے چھوٹے دل والوں کا پہلا تجربہ تھا جو کافی مہینوں تک ذہن سے نہیں نکل پایا۔

آج تیس سال بعد بھی آنکھوں میں وہ لڑکی آتی ہے تو اس کی کہانی ساتھ ہی امڈ آتی ہے، عام سی کہانی ہے لڑکی کسی کو پیار کرتی ہے اور ٹوٹ کر چاہتی ہے، لڑکا بھی رشتہ بھیج دیتا ہے، دونوں کے فرقے و برادری مختلف ہونے کی وجہ سے انکار ہوتا ہے، لڑکی اپنی ماں اور بڑی بہن کو بہت بار بتاتی ہے کہ وہ مر جائے گی مگر کسی اور کے ساتھ شادی نہیں کرے گی، پھر بھی اس لڑکی کا رشتہ جلدی سے کہیں اور طے کر دیا جاتا ہے، ہمیشہ کی طرح والدین سمجھتے ہیں کہ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا کیونکہ شادی تو جیسے کینیڈا کی امیگریشن ہوتی ہے۔

بارات کے انتظار میں پورا خاندان گھر کے صحن میں بیٹھا ہے، لڑکی اپنی ایک سہیلی کی مدد سے کھڑکی سے نکلتی ہے اور جا کر لڑکے کو پیغام پہنچاتی ہے، لڑکا اس صورتحال سے گھبرا کر ڈر جاتا ہے اور اسے پیغام بھیجتا ہے کہ واپس چلی جاؤ، لڑکی کو یقین نہیں آتا کہ وہ لڑکا بھی اسکا ساتھ چھوڑ سکتا ہے، اسکے پاس واپسی کا راستہ نہیں ہے سو وہ نہر میں چھلانگ لگا دیتی ہے، لڑکی کو تیرنا نہیں آتا پانی کے نیچے تیس سیکنڈ بعد اسکا دم ٹوٹ جاتا ہے، تھوڑی دیر میں لاش پانی کی سطح پر واپس آ جاتی ہے اور اور اب اکیلی دلہن کی بارات 25 کلومیٹر سفر طے کر کے رینالہ خورد کے پل پر آکر ٹھہرتی ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ 25 کلومیٹر دلہن کا منہ آسمان کی طرف ہی رہا ہوگا اور وہ دور آسمان میں کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھتی رہی ہوگی کہ تو بتا میں کہاں جاتی؟

میں کالج سے شام سے کچھ دیر پہلے واپس آیا تو پل کراس کرتے وقت ڈرتے ڈرتے نہر کی طرف دیکھا۔ وہ لاش وہیں تھی شاید آج صفائی کا دن نہیں تھا اس لیے اس بارات کو رات یہیں ٹھہرنا تھا۔ رات کو کھلے آسمان تلے جب سونے کے لیے لیٹا تو میں نے غور سے آسمان میں دیکھا کہ شاید مجھے وہ نظر آ جائے تو میں اسے کہوں کہ دلہن کو جواب

تو دے، وہ تو تمھارے جواب کے انتظار میں پلکیں تک جھپکنا بھول گئی ہے۔

نیند نہیں آ رہی تھی کیونکہ میری اور دلہن کی آنکھیں آسمان میں کسی جوابدہ کو تلاش کر رہی تھیں مگر شاید وہ شرمندہ تھا اسلئے نمودار نہیں ہوا۔ شاید وہ کبھی بھی جوابدہ نہیں ہوا ہوگا۔ قانون بنانے والے بھی کبھی قانون کو جوابدہ ہوتے ہیں؟

جواب نہیں آیا مگر یکایک آسمان آئینہ بن گیا اور اس آئینے میں مجھے دلہن نظر آئی، اب بھی اس کی سوالیہ آنکھیں آئینے کی جانب کھلی ہوئی تھیں، میری جانب کھلی ہوئی تھیں ۔ مجھے لگا جیسے اب وہ مجھ سے پوچھ رہی ہو، میں ڈر گیا اور کروٹ بدل لی۔ ہم مرد یہی کرتے ہیں۔

صبح کالج جاتے ہوئے پھر اسی پل صراط سے گزرنا پڑا، میں اب دو دن میں کافی دلیر ہو چکا تھا سو میں نے اعتماد سے نہر کی طرف دیکھا۔

وہاں کسی دلہن کی لاش نہیں تھی

وہاں کسی سوالیہ آنکھوں والی لڑکی کی لاش نہیں تھی

وہاں ہمارے کسی فرقے اور برادری کی لاش نہیں تھی

وہاں کسی کے ضمیر کی بھی لاش نہیں تھی

اور نہ ہی وہاں کسی کی محبت کی لاش تھی

دلہن کی رخصتی ہو چکی تھی ۔۔۔

کھردرا پتھر

اسلام آباد کے پہلو میں مارگلہ کی پہاڑیوں میں قلندری سلسلہ کے ایک بزرگ کی چلہ گاہ تھی، میں بڑی مشکل سے ان کے ٹھکانے تک پہنچا، شدید سردی میں وہ پتھروں سے بنی چھوٹی سی کوٹھڑی میں اکیلے رہتے تھے۔ پہاڑ پر چڑھتے چڑھتے راستے میں ان کا ٹھکانہ تھا سو وہاں تک پہنچنے میں خاصی توانائی درکار ہوتی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ چونکے اور پوچھا کہ راستہ بھٹک گئے ہو؟

میں چونکہ زندگی کے راستے کی تلاش میں تھا اس لیے میں نے استعارہ میں جواب دیا جی ہاں راستے کی تلاش میں ہوں۔

انھوں نے آگ سلگاتے ہوئے میری طرف نظر اٹھا کے دیکھا اور بس "ہوں" کہا

میں نے کچھ دیر کھڑے کھڑے سانس بحال کی تو انھوں نے کہا آ جاؤ بیٹھ جاؤ ۔

وہ خود بھی ایک ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھے تھے، میں بھی ان کے پاس ایک ایسے ہی پتھر پر بیٹھ گیا۔

لکڑیوں سے جلی آگ پر ایک برتن میں وہ کچھ ابال رہے تھے۔ لکڑیوں سے اور پانی سے بھی دھواں اڑ رہا تھا۔

وہ بولے یہاں جو بھی آتا ہے وہ راستہ ڈھونڈنے ہی آ تا ہے یا اوپر کا یا بہت اوپر کا۔

میرے جس دوست نے مجھے ان کے بارے میں پہلی دفعہ بتایا تھا اسنے تعارف یوں کروایا تھا کہ وہ ہر بات معرفت کی زبان اور استعارات کے استعمال سے کرتے ہیں اس لیے جو بھی کہیں اس کا ظاہری مطلب نہیں لینا اور جب وہ حجرے میں چلے جائیں تو بس واپس آ جانا سمجھ لینا محفل تمام ہو گئی ہے۔

تو یہاں اوپر سے مراد پہاڑ کی چوٹی تھی اور بہت اوپر سے مراد انسانی ذات کی بلندی تھی۔

مجھے بھی کہیں سے جوابات کی امداد مل رہی تھی، میں فوراً بولا حضرت مجھے اوپر کا نہیں، اندر کا راستہ چاہیے، صرف اپنے اندر کا راستہ ڈھونڈ کے کہاں جانا ہے؟ انھوں نے پھر میری طرف دیکھے بغیر پوچھا

''خود تک پہنچنا ہے''

انھوں نے اپنے چہرے کی طرف آتے ہوئے دھوئیں کو جھاڑا اور بولے

''کسی بھی چیز، مقام یا جگہ کو ڈھونڈنے کے لیے اس کا ہونا ضروری ہے''

یعنی میں ابھی ہوں ہی نہیں، بات ٹھیک لگی، میں نے سوچا کہ میں کیا ہوں تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ میں کیا ہوں، اگر میں سوچوں کہ میں موجود ہوں تو پتھر بھی موجودات میں سے ہیں، میں سوچوں کہ میں چلتا پھرتا کھاتا پیتا انسان ہوں، کسی کا بھائی کسی کا بیٹا ہوں تو ایسا تو جانوروں کے ساتھ بھی ہوتا ہے پھر میں کیا ہوں؟ مجھے لگا کہ یہی تو ڈھونڈنے آیا ہوں۔

رہنمائی فرمائیں کہ میں کیوں نہیں ہوں اور مجھے ہونے کے لیے کیا کرنا چاہیے

انھوں نے کوئلوں کو لکڑی سے ہلایا اور دوسری طرف سے جھک کر کچھ اٹھایا۔ جب میری طرف مڑے تو ان کے ہاتھ میں ایک بالکل گول گیند نما پتھر تھا۔ میری طرف بڑھایا تو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دعا کی شکل میں ڈھال کر ان سے لے لیا۔

وہ ایک مکمل گول پتھر تھا جیسے کسی ماہر نے اسے دنیا کے نقشے کی طرح مکمل گول تیار کیا ہو۔ وہ بولے

ایک دن میں چلہ کر رہا تھا کہ یہ پتھر اوپر سے آ کر میرے سامنے گرا۔ میں نے اسے اٹھایا غور سے دیکھا اور اسے پوچھا

تم اتنے کھردرے پہاڑ اور نوکیلے پتھروں کے بیچ میں مکمل گول کیسے ہو گئے؟

تو یہ پتھر مجھ سے بولا
میں بھی کھردرا پتھر تھا، ہر طرف سے نوکیلا بھی، جس پر گرتا، جس کو چھو لیتا اسے تکلیف دیتا، اسے زخمی کر دیتا تھا، پھر زلزلہ آیا اس نے مجھے پہاڑ کی بلندی سے لڑھکا دیا، میں جیسے جیسے لڑھکتا گیا ٹھوکریں کھاتا گیا، جب جب ٹھوکر لگتی، میرا نوکیلا حصہ ٹوٹ جاتا، پھر مجھے ہر طرف سے اتنی ٹھوکریں لگیں کہ میری ہر طرف کو نکلی ہوئی نوکیں ختم ہو گئیں اور میں گول ہوتا گیا، مکمل گول۔
انھوں نے بات ختم کی، آگ کے چولہے سے کیتلی اٹھائی اور ایک پیالی میں قہوہ ڈال کر میرے سامنے رکھا اور خود اپنا برتن اٹھا کر حجرے کے اندر چلے گئے۔
میں نے پتھر نیچے رکھا، قہوہ ختم کیا اور اسی راستے سے واپس ہو لیا۔
سارا راستہ ان کی باتوں میں موجود استعارات کو سلیس اردو میں ڈھالنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔
نوکوں سے مراد میری وہ عادتیں اور حرکتیں تھیں جو دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بن رہی تھیں۔
نوکیلے اور کھردرے حصے میرے وہ جملے تھے جو میرے ارد گرد موجود افراد کو دکھ پہنچا رہے تھے جہاں میں عدل پر نہ تھا۔
زلزلہ سوچ میں آتا ہے جس دن انسان اپنے اندر مثبت تبدیلی کا خیال پیدا کرتا ہے۔

لڑھکنے سے مراد زندگی کے وہ تمام واقعات و لمحات ہیں جہاں ہمیں اپنی نوکوں سے دوسروں کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔

پہاڑ کی بلندی سے نیچے آنے کا مطلب تھا کہ جو انا اور غرور ہمیں خیالی بلندیوں پر بٹھا کر رکھتا ہے وہاں سے اپنی اصل کی طرف نیچے اترنا تھا اور یہ نیچے اترنا ہی اصل بلندی تھی کیونکہ دیکھنا یہ ہے کہ کون اللہ کی بارگاہ میں کتنا بلند ہے، نہ کہ لوگوں کی نظر میں۔

گول ہونے سے مراد بے ضرر ہونا ہے، جس سے دوسروں کا دل و جان و مال محفوظ ہو۔

یہ بیس سال پرانا واقعہ ہے مگر مجھے آج بھی لگتا ہے جیسے میں ان سے مل کر نیچے اتر رہا ہوں اور ابھی تک کھردرا پتھر ہوں، ذرا سا بھی گول نہیں۔

کیوں

مدتوں پہلے انسانی نفسیات کی ایک بہت بکنے والی کتاب کے بارے میں معلوم پڑا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہر چیز کی ایک ظاہری وجہ ہوتی ہے اور ایک اصل وجہ، ظاہری وجہ ٹھیک کرنے سے وقتی طور پر مسئلہ حل ہو سکتا ہے مگر مستقل نہیں، ظاہری وجہ تو ہم سب کو معلوم ہوتی ہے مگر اصل وجہ جاننے کے لیے آپ کو اس بات یا واقعہ پر پانچ دفعہ کیوں لگانا پڑتا ہے اور آخر میں جو جواب آئے وہی اصل وجہ ہے، اسے اگر درست کر لیا جائے تو مسئلہ مستقل طور پر حل ہو جاتا ہے۔

اس کو سمجھنے کے لیے ایک سادہ اورآسان سی مثال لیتے ہیں۔ ایک دن آپ صبح دفتر کے لئے روانہ ہونے لگے تو پتہ چلتا ہے کہ گاڑی سٹارٹ نہیں ہو رہی۔ آئیے اس واقعہ پر پانچ دفعہ کیوں لگا تے ہیں۔

1۔ گاڑی کیوں سٹارٹ نہیں ہوئی؟

آپ نے دیکھا کہ سلف ہی نہیں کام کر رہا، آپ نے دو تین دفعہ چابی گھمائی مگر سلف نہیں کام کر رہا۔

2۔ سلف کیوں کام نہیں کر رہا؟

سلف کو بیٹری نے طاقت مہیا کرنی ہوتی ہے کام کرنے کے لیے، تو مسئلہ بیٹری کے ساتھ ہے۔

3 ۔ بیٹری کیوں نہیں کام کر رہی؟

بیٹری کو چلنے کے لئے اس کے اندر پانی اور چارجنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نے بیٹری چیک کی تو پتہ چلا اس میں پانی نہیں تھا۔

4۔ بیٹری میں پانی کیوں نہیں تھا؟

بیٹری کا پانی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتا جاتا ہے اور زیادہ وقت گزر جائے تو ختم ہو جاتا ہے اور بیٹری کام چھوڑ دیتی ہے۔

5۔ آپ نے بیٹری میں پانی کیوں نہیں ڈلوایا؟
کیوں کہ آپ ایک عدد سست یا careless انسان ہیں اس لئے آپ نے

اپنی ذمہ داری وقت کے ساتھ نہیں نبھائی۔ تو اصل مسئلہ بیٹری کا نہیں، سلف کا نہیں، اس کے پانی کا نہیں بلکہ آپ کے اندر ہے۔ اگرآپ اصل مسئلہ حل نہیں کریں گے، اپنی عادت نہیں بدلیں گے اوربیٹری یا سلف ٹھیک نہیں کروائیں گے تو آپ کی گاڑی ہمیشہ بند ہوتی رہے گی۔

دوسری مثال دیکھتے ہیں۔

فرض کریں کسی ملک کے حکمران بہت زیادہ کرپشن کرتے ہوں ویسے ہو سکتا ہے آپ کو میرے فرض کرنے پر بھی اعتراض ہو مگر فی الحال فرض کریں۔ اب اس کرپشن پر پانچ دفعہ کیوں لگا کر دیکھتے ہیں کہ حل کیا نکلتا ہے ۔

1۔ حکمران کیوں کرپشن کرتے ہیں؟

کیوں کہ ان کے پاس کھلے اختیارات ہیں اور جس کے پاس جتنا بڑا اختیار ہوگا وہ اتنی زیادہ کرپشن آسانی سے کر پائے گا۔

2۔ ان کے پاس اتنا بڑا اختیار کیوں ہے؟

کسی بھی پارلیمانی ملک میں وزیر اعظم بڑا ترین عہدہ ہوتا ہے اور اس کا اختیار و طاقت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔

3 ۔ ایسا انسان وزیر اعظم کیوں ہے؟

وزِیرِاعظم بننے کے لیے پارلیمان میں ایک خاص اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے جب پارلیمان میں اتنی اکثریت کرپٹ ہوگی تو اپنے جیسے کرپٹ کو ہی وزیر اعظم بنانے میں مددگار ہوگی۔

4 ۔ پارلیمان کی اکثریت کرپٹ کیوں ہے؟

پارلیمان کے اندر وہ لوگ بیٹھے ہوتے ہیں جن کو عام عوام اپنے زیادہ ووٹ ڈالنے سے اور باقی عوام جو ایلکشن کو سپورٹ کرنے والے اداروں میں نوکری کرتے ہیں وہ ان اداروں میں اپنے اپنے ناجائز اختیارات استعمال کرتے ہوئے ایسے کرپٹ افراد کو کامیاب کروا دیتے ہیں اور اس طرح کرپٹ افراد کی اکثریت سے پارلیمان بھر جاتا ہے۔

5۔ عوام ایسے کرپٹ افراد کو کیوں مدد کرتی ہے الیکشن جیتنے کے لئے؟

کیوں کہ عوام کے اپنے مفاد ایسے لوگوں سے وابستہ ہوتے ہیں اور کہیں کہیں کم علمی یا جہالت بھی اس کی بنیادی وجہ ہے۔

اب یہی پانچ کیوں لگانے کے بعد ہمیں علم ہوا کہ عوام کی اپنے ذاتی مفاد کی ہوس اور جہالت، حکمرانوں کی کرپشن کی اصل وجہ ہے۔ پس اگر کرپشن کو مکمل طور پر ختم کرنا ہے تو حکمران بدلنے سے پہلے عوام کو اپنے اپنے ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھنا ہوگا اور جہالت کو علم سے ختم کرنا ہوگا کرپشن خود بخود ختم ہو جائے گی وگرنہ ہم نے پچھلے 75 سالوں سے حکمران بدل بدل کر دیکھ لیے ہیں، کوئی فرق پڑتا نظر نہیں آ رہا۔

اللہ ہمیں انسانی نفسیات کو سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
آمین

جلا ہوا قرآن

مجھے زندگی کے پہلے 35 سال تک قرآن سے اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا ہر پاکستانی کو ہوتا ہے یعنی نہ ہونے کے برابر۔ ہمارا قرآن سے تعلق کسی نہ کسی لالچ سے جڑا ہوتا ہے پاکستانی قرآن کو اگر صبح کے وقت پڑھیں تو ثواب کی ٹوکریاں بھرنے کے لیے پڑھتے ہیں، آیت الکرسی ایڈوانس انشورنس کے طور پر استعمال کی جاتی ہے، چار قل ہمارے سیکیورٹی گارڈ ہیں، جب ہم قرآن کے دل کو پکڑنا چاہتے ہیں تو سورۃ یاسین پڑھتے ہیں، کسی کی جان نکالنی ہو تب بھی سورۃ یاسین عزرائیل سے ہمارا رابطہ کروا دیتی ہے اور جب ہمارے اپنے دل کو کوئی مسئلہ لاحق ہو جاتا ہے تو سورۃ رحمان دل کے سرجن کے طور پر کام کرتی ہے، ہماری نوکری یا کاروبار کے ساتھ جب کوئی واقعہ رونما ہو جائے تو سورۃ واقعہ کی قرأت، رمضان ہو تو پورا قرآن کھڑے ہو کر سن لیتے ہیں اور بقول عامر سہیل صاحب رمضان میں یعلمون اور تعلمون کے علاوہ کوئی لفظ بھی سمجھ نہیں آتا برق رفتاری کی وجہ سے۔۔۔

اللہ قرآن میں سورتہ المائدہ آیت 44 میں فرماتا ہے

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ

اور جو للہ کے نازل کردہ (قرآن) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

اگلی تین آیات کے اندر ہی فرمایا گیا کہ جو اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظالم بھی ہیں اور فاسق بھی۔ تین القابات اور تینوں نہایت خطرناک۔۔۔

کافر
ظالم
فاسق

پہلی دفعہ جب اس آیت پر غور کیا اور اپنے اوپر لاگو کر کے دیکھا کہ میں نے زندگی میں کتنے فیصلے قرآن میں سے دیکھنے کے بعد کیے؟ یقین جانیے ایک بھی نہیں، میں نے زندگی میں تعلیم حاصل کی، اندرون اور بیرون ملک سفر بھی کیا اور نوکریاں بھی، کاروبار بھی کیا، شادی بھی، جھگڑے بھی کیے اور صلح بھی، جائداد بھی تقسیم کی مگر کبھی قرآن سے نہیں پوچھا کہ یہ سب کیسے کرنا ہے۔ مجھے لگا جیسے میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوں اور ہر طرف سے کافر، ظالم

اور فاسق کی آوازیں مجھ پر کسی جا رہی ہیں اور میں ان کا کوئی جواب نہیں دے پا رہا، بس چپ چاپ نظریں جھکائے شرمندہ کھڑا ہوں۔

اس شرمندگی نے قرآن کو سمجھنے کی خاطر پڑھنے پر مجبور کیا، عربی زبان بھی اسی شوق میں سیکھی اور قرآن کو ایک طالب علم کی حیثیت سے پڑھنا شروع کیا۔ میں نے جتنا بھی قرآن کو پڑھا مجھے لگا وہ مجھ سے بات کر رہا ہے میرے مسائل، میری ذہنی، جسمانی، معاشی اور معاشرتی نگہداشت کے بارے میں۔ وہ میری توجہ میرے ارد گرد موجود اللہ کی بنائی ہوئی سائنس کے کمالات کی طرف مرکوز کرنا چاہ رہا ہے، اور تو صرف غور و فکر کرنے کا حکم ہی تقریباً 500 دفعہ قرآن میں موجود ہے، ایک طرف حیرتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا کہ قرآن میں میرے تمام مسائل کا اتنا آسان حل موجود تھا اور مجھے پتہ ہی نہ تھا اور دوسری طرف شرمندگی تھی کہ میں نے زندگی کی اتنی دہائیاں اس نادر کتاب کو پڑھے بغیر گزار دیں۔

اس سے بڑا المیہ یہ تھا کہ مجھے اپنے علاوہ بھی کوئی ایسا انسان نہ نظر آیا جو قرآن سے ہدایت کا استفادہ کرتا ہو، ایسا بھی نہیں دیکھا کہ ہدایت کہیں اور سے لے کر قرآن سے اس کا ثبوت ہی دیکھ لیا جائے۔ اپنی

ذاتی اور اپنے ارد گرد کے معاشرے کی قرآن سے اس قدر دوری دیکھ دیکھ ڈوب مرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ نظر آتا تھا۔ قرآن نے ایک جگہ میری یہ حالت زارِ بھی بیان کی ہوئی تھی

وَ قَالَ الرَّسُوۡلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَہۡجُوۡرًا

اور رسول کہے گا کہ اے میرے پروردگار! بیشک میری امت نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا ۔ (الفرقان 30)

یہ قیامت کا منظر بیان ہو رہا ہے جس میں رسول، اللہ سے اپنی قوم کا حال بیان کر رہے ہیں۔ بہت مدت پہلے ایک محفل میں بیدم وارثی صاحب کا ایک کلام سنا تھا جس میں ایک شعر نے بہت داد وصول کی

عجب تماشا ہو میدانِ حشر میں بیدم
کہ سب ہوں پیش خدا اور میں روبروئے رسولﷺ

یہ شعر یقیناً رسول اللہ سے محبت میں لکھا گیا ہوگا مگر میں نے تو اپنی زبوں حالی دیکھتے ہوئے صاف انکار کر دیا کہ مجھے بالکل بھی رسول اللہ کے سامنے پیش نہیں ہونا، نہ میں ان سے نظریں ملانے کے قابل اور

نہ منہ دکھانے کے، اوپر سے وہ کہہ رہے ہونگے کہ اس امت کی ہدایت کے لئے میں ایک ہی کتاب لایا تھا اور ان سے وہ بھی صحیح طرح نہیں پڑھی گئی۔

بتانے کا مقصود یہ تھا کہ میں نے تو قرآن کو کبھی ہدایت کے لئے ہاتھ نہ لگایا تھا اور اپنے ارد گرد جتنے افراد سے بھی رابطہ کیا، سب میرے جیسی حالت میں تھے، کچھ عرصہ عرب ریاستوں میں بھی رہنے اور سفر کرنے کا اتفاق ہوا مگر وہاں بھی ایسے فرد واحد کی تلاش، تلاش ہی رہی۔ مجھے لگا جیسے صدیوں پہلے قرآن کو پس پردہ ڈال کر ہم اپنی اپنی زندگیوں میں، اپنے اپنے مفادات میں، اپنی اپنی شریعتوں میں اتنے مگن کر دیے گئے اور ہو بھی گئے کہ قرآن کی ضرورت محسوس کرنے والا جذبہ بھی مر گیا۔

مجھے یہ آیت تو قرآن سے مل گئی کہ رسول اللہ نے اپنی قوم سے شکوہ کیا کہ یہ قرآن کو چھوڑ بیٹھی ہے مگر ایسی کوئی آیت نہ ملی جس میں کسی دوسری قوم کے قرآن جلانے پر واویلا کیا جا رہا ہو، میں نے چند ایک ٹوٹی پھوٹی کتابیں لکھی ہیں اور مجھے زیادہ افسوس ہوگا کہ میری کسی بھی کتاب کو غلط مقصد کے لیے پڑھا جائے یا اس کا مقصد ہی بدل کے

رکھ دیا جائے اس بات پر مجھے بہت کم یا شاید ہی کچھ افسوس ہوگا کہ کوئی مخالف میری کتاب کو جلا دے۔

اللہ کی کتاب کا کسی کتاب سے کوئی موازنہ ممکن ہی نہیں تو ایسی کتاب کو پڑھنے کا مقصد بدل کے رکھ دینا اور رسول اللہ کی قوم کا اسے ہدایت کے لئے ہاتھ ہی نہ لگانا کسی غیر کے اس کتاب کو جلانے سے بہت بڑا جرم ہے۔

جس کسی نے کتاب اللہ جلائی ہے اس نے مسلمانوں کی سخت دل آزاری کی ہے اور ہم مسلمان، رسول اللہ کی دل آزاری میں صدیوں سے دن رات ایک کرتے آرہے ہیں۔

کاش! اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

دل کے رشتے

ہماری زیادہ تر محفلوں میں دوست، اپنے اپنے رشتہ داروں سے نالاں، ناخوش یا پھر کہیں قطع تعلقی کی حد تک پہنچے نظر آتے ہیں اور اپنے رشتہ داروں کے قصے سناتے ہیں جس کے آخر میں رشتہ دار ظالم اور ہم مظلوم ثابت ہو جاتے ہیں۔ یہ قصے اپنے دوستوں کو سنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک دوست رازدار بھی ہیں اور مخلص بھی۔ آپ اس بات سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے ملک کے ننانوے فیصد افراد اپنے رشتہ داروں کو اچھا یا مخلص نہیں سمجھتے۔ یہ بات سن کر میرا پٹھان دوست کہتا ہے کہ تمھارا فارمولا غلط ہے، اصل میں ننانوے فیصد نہیں، صرف پچاس فیصد افراد اپنے رشتہ داروں کو ایسا سمجھتے ہیں، میں جب پوچھتا ہوں کہ باقی پچاس فیصد کیا کرتے ہیں تو وہ کہتا باقی پچاس فیصد ان پچاس فیصد کے ہی رشتہ دار ہیں اور وہ بھی کہیں بیٹھ کر ان کے بارے میں یہی کہہ رہے ہوتے ہیں۔ وہ مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر کسی کے لیے دل سے سوچنا پڑے تو سمجھ لو رشتہ دار نہیں ہے اور کسی کے لیے ہر وقت دماغ کھپ رہا ہو تو سمجھ جاؤ وہ رشتہ دار ہے۔

انسانی نفسیات کا طالب علم ہونے کے ناطے مجھے تجسس رہتا تھا کہ میں

اس قومی المیے کی وجوہات جان سکوں اور آج تک بھی اسی کے ایک خاطر خواہ جواب کا منتظر ہوں۔

قرآن کا مطالعہ کرتے کرتے دو لفظوں نے مجھے اپنی طرف زور سے متوجہ کیا، پہلا لفظ تھا الارحام، یہ ارحام کا اسم معرفہ ہے اور اس کا واحد رحم ہے، ارحام کا معنی وہ لوگ ہیں جو ایک عورت کے رحم سے پیدا ہوئے ہوں بلکل جیسے کہ ایک دادی کی اولاد اور ایک نانی کی اولاد، ان دو رحموں کو جمع میں ارحام پکارا جاتا ہے اور اس کا عمومی مطلب ہمارے والد اور والدہ کی طرف سے رشتہ دار ہیں اور شاید جب رشتہ داروں کے شکوے چل رہے ہوتے ہیں تو انھیں ارحام کی بات ہو رہی ہوتی ہے۔ اب ان دونوں میں سے بھی اکثریت اپنے والد کی طرف کے رشتہ داروں کی برائی زیادہ کیوں کرتے ہیں یہ ایک الگ اور نہایت توجہ طلب موضوع ہے مگر اس وقت ہم تمام ارحام کی ہی بات کریں گے۔

دوسرا لفظ اقربا ہے جو قرب کے مادہ سے بنا ہے۔ اس کا مطلب قریب کے افراد ہیں جو دل و دماغ سے قریب ہوں، قرب میں وہ افراد ہوتے ہیں جن سے قرب ہو، ان سے رحم کا رشتہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

پس ارحام وہ ہیں جن سے خونی رشتہ ہے اور اقرباء وہ ہیں جن سے دل کا قرب ہو۔ ارحام میں صرف رشتہ دار آتے ہیں اور اقرباء میں قریبی افراد ہیں جن میں رشتہ دار بھی شامل ہو سکتے ہیں اگر وہ بھی دل سے قریب ہوں۔

قرآن میں ارحام والے رشتہ داروں کا تذکرہ صرف 4 بار اور قرب والے لوگوں کا ذکر 22 بار آیا ہے۔ یہ اعداد و شمار واضح نشانی ہیں جو انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ انسان اپنے سے قرب رکھنے والے لوگوں کو ہی ہم خیال، ہم سفر اور ہمراز بناتا ہے جبکہ رشتہ داروں کو ایک رحم سے ہونے کی وجہ سے جھیل تو لیتا ہے مگر اپنائیت نہیں پیدا ہو پاتی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں ارحام کی نسبت اقربا پر پانچ گنا زیادہ زور دیا ہے۔

علم نفسیات کے مطابق انسان اسی کے ساتھ راحت محسوس کرتا ہے جس سے خوف نہ ہو یا جس کے بارے میں یقین ہو جائے کہ اسے ہم سے کوئی لالچ نہیں ہے، یہ بات بھی صد فیصد درست نظر آتی ہے کیونکہ ہماری عدالتوں میں آج بھی 16 لاکھ مقدمات فیصلے کے منتظر ہیں جو صرف جائداد یعنی پراپرٹی کے متعلق ہیں اور ان 16 لاکھ میں

سے ننانوے فیصد مقدمات نہایت قریبی رشتہ داروں کے مابین ہیں کیونکہ وراثتی جائیدادوں کی تقسیم کے وقت ہمارے اندر کا لالچ ابھر کر رشتوں سے بلند ہو جاتا ہے اور رشتے چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔

دوسرا پہلو دیکھئے، ہمارے ملک میں 68 فیصد شادیاں رشتہ داروں یعنی کزنز کے بیچ میں ہوتی ہیں جو دنیا کے سب سے زیادہ اعداد و شمار رکھنے والے ممالک میں سے ایک ہے۔اس کے انسانی صحت پر نقصانات اور موروثی بیماریوں کا پھیلاؤ ایک اور گھمبیر ترین صورتحال ہے مگر ابھی ہم صرف طلاق کے موضوع تک محدود رہیں گے۔پاکستان میں ایک کروڑ 70 لاکھ طلاق یافتہ افراد ہیں جن میں سے ایک کروڑ دس لاکھ طلاقیں رشتہ داروں یعنی کزنز کے مابین ہوئی ہیں اور یہ رشتہ داروں کے درمیان طلاق اکثر پورے خاندان کو دو حصوں میں بانٹ کے چھوڑتی ہے۔ پھر سے ارحام اور اقربا کے مابین فرق واضح طور سے نظر آ رہا ہے ۔

قرآن میں موجود انبیاء کے قصے پڑھ کر دیکھئے، ہابیل کا بھائی قتل کرتا ہے، جناب نوح کا بیٹا نافرمانی، ابراہیم کے والد ساتھ نہیں دے رہے، لوط کی بیوی بے وفائی کرتی ہے، یعقوب کے بیٹے ہوں یا یوسف کے

بھائی حسد اور دغابازی سے بھر پور، سب رشتہ داروں کی زیادتیوں اور بے وفائیوں کی داستانیں ہیں ہمارے اپنے نبی جب اپنے رشتہ داروں اور آبائی علاقے کو چھوڑ کر ہجرت کرتے ہیں تو ان کی تحریک کو چار چاند لگ جاتے ہیں کیونکہ تحریک میں اقربا ہی اقربا شامل ہو رہے ہیں جبکہ رشتہ داروں یعنی ابو سفیان اور ابو جہل جیسے لوگوں نے آپ کا اپنے آبائی علاقے میں رہنا تقریباً ناممکن بنا کر رکھ دیا تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اقربا وہ ہیں جن کے قریب آنے کو دل کرتا ہے، جن کا قرب ہمیں سکون دیتا ہے، ہمیں بے خوف کرتا ہے، جن کو ہم سے لالچ یا حسد نہیں ہوتا، زندگی کو آسان اور خوبصورت بنانے کے لئے ارحام اور اقربا کو الگ کرنا سیکھیں، اقربا سے دل کا رشتہ ہوتا ہے حالانکہ ان سے کوئی ارحام جیسا رشتہ نہیں ہوتا، شاید یہی قرب کی اصل وجہ ہو۔ واللہ اعلم

چوپایوں کا اشرف المخلوقات

ایک گرو جی کہا کرتے تھے کہ اللہ کو سمجھنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ انسان کو سمجھا جائے اور انسان کو سمجھنے کے ذریعوں میں سے ایک نہایت اہم ترین ذریعہ جانوروں کا مطالعہ ہے۔ نوجوانی سے یہ بات دل میں گھر کر گئی اور جانوروں سے لگاؤ ہو گیا۔ پتہ چلا کہ انسانوں کی طرح وہیل مچھلی، چیونٹیاں، شہد کی مکھی اور بھیڑیا ان جانداروں میں سے ہے جو خاندانی نظام، معاشرہ اور کالونیاں بنا کر جیتے ہیں۔ ان جانوروں کی زندگی اور معاشرت کا مطالعہ انسان کی زندگی سے حد درجہ قریب اور عجیب تر ہے۔ ان کے ہاں بھی جذبات، رشتے اور جائداد کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ آئیے مل کر بھیڑیوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کو اور ان سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بھیڑیوں کے ہاں ایسے قوانین ہیں جن پر وہ مرنا تو گوارہ کر لیتے ہیں مگر جھکتے نہیں، بھیڑئیے کے گلے میں اگر پٹہ ڈال دیا جائے تو مرتے دم تک لڑتا رہے گا مگر انسان کا غلام نہیں بنتا جبکہ کتے نے اس غلامی کو قبول کر لیا خوشی سے۔ ارتقاء کی تحقیق و تعلیمات کے دوران یہ مطالعہ مشہور ہے جس میں کچھ جانوروں کے انسانوں کے قریب آنے اور کچھ کے انسانوں سے دور رہنے کی وجہ یہی بیان کی جاتی ہے۔

بھیڑیا ان سمجھدار جانداروں میں سے ہے جن میں اپنے بڑوں اور بزرگوں کو دھتکارنے کی بجائے ان کے تجربے سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا ہے، جانوروں کے علوم پر مہارت رکھنے والے افراد اپنا تجزیہ بتاتے ہیں کہ بھیڑیوں کے جس بھی ریوڑ میں بوڑھے اور تجربہ کار بھیڑیے زیادہ ہوتے ہیں وہی ریوڑ اس ریاست کی جنگ کو جیتنے میں کامیاب ہوتا ہے کیونکہ وہ بوڑھے بھیڑئیے متعدد بار ایسی صورتحال کا سامنا کر چکے ہوتے ہیں حالانکہ کہ جوان بھیڑیوں کی تعداد دونوں طرف برابر ہوتی ہے۔

کہا جاتا ہے بھیڑیوں کا سب سے ناپسندیدہ جاندار انسان ہے، بھیڑیا ہر جاندار کے ساتھ رہ لیتا ہے مگر انسان کے ساتھ نہیں۔ وجہ بتائی جاتی ہے کہ انسان محبت کے نام پر بھی دھوکہ دیتا ہے اور بھیڑیا نہیں دیتا۔ اس طرح دو متضاد جانداروں میں سے نکلنے والی مثبت اور منفی شعاعیں کبھی آپس میں موافقت نہیں پیدا کر پاتیں۔

کم وسائل، کم آمدن یا کمی کے ساتھ پیدا ہونے والے اکثر انسان زندگی بھر اپنی کمی کا شکوہ کرتے نہیں تھکتے اور اپنی زندگی کی بیشتر ناکامیوں کا بہانہ اسی کمزوری کو بناتے ہیں مگر بھیڑیے پر غور کریں یہ جب پیدا

ہوتا ہے تو پہلے دو ہفتوں تک اندھا بھی ہوتا ہے اور بہرا بھی، یہ اپنے اندھے اور بہرے پن کی رکاوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی آواز کی مختلف حالتوں سے اپنی کیفیات یعنی بھوک، تکلیف، خوشی یا ناراضگی کا اظہار کر لیتا ہے اور بھیڑئیے کی سمجھدار ماں اپنے بچے کی آواز کے انداز سے اس پر گزرنے والی کیفیات کو بھانپ لیتی ہے۔

کسی ہندی فلم میں ہیرو اپنی ماں سے کہتا ہے ماں تم میری بات نہیں سمجھ رہی تو ماں کہتی ہے میں تب تو تمھاری سب باتیں اور ضرورتیں سمجھ لیتی تھی جب تم بول بھی نہیں سکتے تھے، اب تم بول بھی سکتے ہو اور تمھیں لگتا ہے ماں نہیں سمجھ سکتی۔ اس کے برعکس بھیڑے کا بچہ جب ایک ماہ کی عمر تک پہنچتا ہے تو اپنی ماں کی طرح سب کی آوازوں سے اس کی مرضی جان لیتا ہے اور اگر ماں خاموش ہو تو یہ اس کے چہرے کے تاثرات سے سمجھ لیتا ہے کہ ماں کیا سوچ یا چاہ رہی ہے۔ بھیڑیا جب سننے کی حس کا استعمال کرتا ہے تو کمال دکھاتا ہے، ایک عام بھیڑیا 8 میل یعنی 13 کلومیٹر تک سننے کی حس رکھتا ہے۔ آپ سوچیں اگر کوئی 8 میل تک سننے کی صلاحیت رکھتا ہو تو ہر وقت اس کے کان میں کیسی کیسی آوازیں آتی ہوں گی پھر بھی اس کی توجہ صرف ساتھی بھیڑیوں کے بھیجے گئے پیغامات پر مرکوز رہتی ہے۔

بھیڑیوں کی یہ صلاحیت بھی ہماری نفسیات کے لیے بڑا پیغام دیتی ہے کہ کیسے زندگی میں غیر ضروری شور، لوگوں اور معاملات سے اعراض برتنا چاہیئے اور اپنی پوری توجہ اپنے مستقبل، ضروری اور مثبت چیزوں پر قائم رکھنی ہے۔

دماغ میں ایک خاص حصہ ہے جس کا ایک مخصوص کام ہوتا ہے کہ وہ ہمیں کسی بھی موقع پر جھوٹ، دھوکہ، منافقت یا بے وفائی کا سبق پڑھاتا ہے تاکہ ہم اس صورت حال سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوں مگر تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ ایسا انخلاء یا تو فوراً انسان کو ڈبو دیتا ہے یا پھر وقتی فائدہ پہنچا کر دائمی مصیبت کا شکار کر دیتا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ بھیڑیوں کے دماغ میں وہ حصہ ہی نہیں ہوتا یعنی ممکن ہی نہیں ہے کہ بھیڑیا اپنوں سے بے وفائی کرے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ انسانوں کے بیچ لفظ بھیڑیا بے حسی و درندگی کی کیفیت بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر یہی بھیڑیا جب ایک دفعہ کسی کو شریک زندگی بنا لیتا ہے تو مرتے دم تک یہ بندھن قائم رکھتا ہے۔ ایک نامکمل تحقیق کے مطابق بھیڑیوں کا جوڑا محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر وہ اس محبت کو مرتے دم تک نبھاتا ہے۔

بھیڑیوں کا تجزیہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ بھلے انسانوں کی مانند بھیڑیوں کا جوڑا بھی اپنے ساتھی کا ساتھ نہیں چھوڑتا، نہ قحط سالی میں نہ بیماری میں حتیٰ کہ موت ہی انھیں جدا کر پاتی ہے۔ ایک انگریز محقق کے مطابق بھیڑئیے جانوروں میں رومیو اور جولیٹ کی واحد اور واضح مثال ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے اگر بھیڑیوں کا سردار کسی لڑائی میں ایک ٹانگ کھو بیٹھے تب بھی اس کی مادہ زندگی بھر اسی کے ساتھ ہوتی ہے۔

جب دو بھیڑیے آپس میں ازدواجی رشتہ قائم کرتے ہیں تو ایسے بھیڑیوں کو الفا کہتے ہیں باقی سب بھیڑیے کبھی بھی الفا کی لڑائی میں نہیں پڑتے اور ان دونوں کے رشتے کا احترام کرتے ہوئے اپنے قبیلے کا باقی نظام سنبھال لیتے ہیں اور خود ساتھی نہیں بناتے کسی کو۔ یوں یہ الفا جوڑا سردار کہلاتا ہے اور قبیلے کی نسل کو آگے بڑھاتا ہے۔ باقی سب اپنی ریاست کی حفاظت، دیکھ بھال اور نئے بچوں کی تربیت میں مگن ہو جاتے ہیں۔ کبھی کسی بھیڑیے کو اپنے قبیلے کے قوانین توڑتے نہیں پایا گیا۔

شیر اور چیتا یہ کام کر لیتے ہیں مگر بھیڑیا کبھی ایک جگہ کھڑے ہوئے شکار پر حملہ نہیں کرتا۔

ایک جملے میں بھیڑیوں کو بیان کرنا ہو تو کہنا چاہیے کہ بھیڑیا چوپایوں میں اشرف المخلوقات ہے۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سکون کیا ہے؟

ہمارے ہاں آرام اور سکون عمومی طور پر یکساں معنوں میں استعمال ہوتا ہے مگر حقیقت قدرے مختلف ہے۔

آرام کا لفظ جسمانی اور ظاہری سہولیات کے رد عمل کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں بڑا گھر، بڑی گاڑی اور زیادہ سی دولت کو سکون پانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے جبکہ ان چیزوں کا سکون سے کوئی واسطہ نہیں، یہ سب چیزیں جسمانی آرام کے لئے ہیں۔ اس کی ایک آسان مثال گھر میں لگا ائر کنڈیشنر ہے جو ہمیں شدید گرمی کے موسم میں ٹھنڈک مہیا کرتا ہے، یہ ٹھنڈک جسمانی آرام تو مہیا کر سکتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ائر کنڈیشنر والے کمرے میں بیٹھا انسان سکون کی حالت میں بھی ہو۔ ایسی ہی کسی کیفیت کو کسی شاعر نے یوں لکھا تھا

سکندر خوش نہیں ہے لوٹ کر دولت زمانے کی
قلندر دونوں ہاتھوں سے لٹا کر رقص کرتا ہے

تو پھر سکون کیا ہے؟

سکون کا جسم یا ظاہر سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے اس کا رشتہ ہمارے اندر سے جڑا ہے، دل کے چین سے وابستہ ہے روح کی تسکین سے متصل ہے۔ یہ ممکن ہے کہ انسان ظاہری طور پر ان تمام چیزوں سے دور ہو جو آرام مہیا کرتی ہیں مگر پھر حالت سکون میں ہو، میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا جو گھر کا آرام چھوڑ دیتے ہیں مگر سکون پا لیتے ہیں، بہت آرام حاصل کرنے کے لیے جو دولت کماتے ہیں انھیں جب سکون نہیں ملتا تو وہ اس دولت کو ضرورت مند افراد تک پہنچا کر سکون حاصل کرتے ہیں ۔ (عرفان الحق صاحب سے شکریہ کے ساتھ)

سب سے بڑی مثال ہمارے نبی کی زندگی میں موجود ہے جب سرداران قریش جنابِ ابو طالب کے گھر آئے اور ان سے کہا کہ اگر آپ کا بھتیجا باز نہ آیا تو ہم اس کا بائیکاٹ کریں گے اور اس کی مخالفت میں آپ کا بھی لحاظ نہیں کریں گے۔ اب سرداران قریش کی مخالفت کا مطلب تھا کہ ہمارے نبی کو معاشرتی اور معاشی دباؤ کا سامنا کرنا ہو گا جو کسی بھی انسان کے آرام کا خاتمہ کرتا ہے۔ جب یہی بات جنابِ ابو طالب نے رسول اللہ کو بتائی تو آپ کا جواب یہ تھا

اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیا

جائے تو بھی میں اپنا مشن نہیں چھوڑوں گا۔

غور کریں کتنا سکون ہو گا اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے اور ان کی زندگیاں بہتر بنانے میں جو ہمارے نبی نے اس کے بدلے میں ساری مشکلات مول لے لیں۔ آرام چھوڑ دیا اور سکون کی معراج تک پہنچ گئے۔

انسان کو آرام سے دور کرنے کے لیے سزا کے طور پر جیل بنائی گئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ مشہور افریقی رہنما نیلسن منڈیلا اپنی زندگی کے 27 سال جیل میں گزار کر بھی سکون کی حالت میں رہتے ہیں اور سکون بھی اتنا کہ جب وہ 27 سال بعد جیل سے باہر آتے ہیں تو اگلے تین سالوں میں اپنے خطے کی تقدیر بدل کے رکھ دیتے ہیں۔ یعنی 27 سالہ جیل کی بے آرامی ان کے سکون کو ذرہ برابر بھی برباد نہیں کر پائی۔

معاشرتی محقق یہ بتاتے ہیں کہ انسان جتنا آرام حاصل کرنے والی چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہے اتنا ہی اپنے سکون کی مقدار کم کرتا جاتا ہے اور ایک دن ایسا آتا ہے جب اس کی زندگی میں آرام دینے والی ساری

اشیاء تو موجود ہوتی ہیں اور پھر بھی وہ نہایت بے سکونی کا شکار ہوتا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق دنیا کے 60 فیصد سے زائد ڈیپریشن کا شکار لوگ دولت مند ہوتے ہیں۔ غریبوں میں اس کی شرح نہایت کم ہے کیونکہ 30 فیصد متوسط طبقہ بھی اس ذہنی کیفیت کا شکار ہوتا ہے۔

بے سکونی کی وجوہات پر تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ مندرجہ ذیل چیزوں کو ترک کر دیا جائے

1۔ زہر بھرنے اور اگلنے والے افراد سے روابط
2۔ صرف آرام کی خاطر پاگل پن کا شکار لوگ
3۔ افراد و حالات کو کوستے رہنے کی عادت
4۔ لوگوں کو متاثر کرنے کی خواہش
5۔ زندگی میں ہر چیز پرفیکٹ چاہنا

بے سکونی کے شکار افراد انہی چیزوں میں گھرے ہوتے ہیں اور انہی چیزوں کے حصول سے ہی وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مسئلہ حل ہو گا اور یوں اس نہ ختم ہونے والے گھن چکر میں ان کی ساری زندگی بیت جاتی ہے۔

اب اگر بے سکونی کی وجوہات واضح ہیں تو سوال یہ ہے کہ سب سے پرسکون کیا شے ہے جس سے اس بے سکونی کو ختم کیا جا سکے؟

قرآن میں اس سوال کے جواب کی تگ و دو کرتے ہوئے سورۃ روم آیت 21 میں ارشاد باری تعالٰی ملتا ہے کہ

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةًؕ-اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے ازواج (ساتھی ، ہم خیال) بنائے تاکہ تم ان کی طرف سے آرام پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھی۔ بے شک اس میں غوروفکر کرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔

غور کریں اللہ تعالٰی نے ہم خیال انسان یا انسانوں کو سکون حاصل کرنے کے لیے اپنی نشانی قرار دیا ہے، پورے قرآن کو اٹھا کر دیکھ لیجیے کسی اور نشانی کو باعث سکون قرار نہیں دیا گیا۔ لتسکنو یعنی تم سکون ہی حاصل کرو گے اگر ساتھ چلنے والا ہم خیال بھی ہے کہ وہ بھی سکون کا

متمنی ہے نا کہ صرف آرام کا۔ آگے دیکھیے فرماتا ہے کہ اس سکون کی سب سے بڑی دو وجوہات ہوں گی۔

پہلی وجہ اللہ تعالیٰ نے مودت بتائی یعنی آپ ایک دوسرے کے لیے ایسے لازم و ملزوم ہوں جیسے مچھلی پانی کے ساتھ ہوتی ہے، اگر کسی کو آپ کے بغیر رہنے میں دقت نہیں ہوتی تو وہ آپ کا زوج نہیں ہے، ایسا شخص وہ تمام کام کر لے گا جو دو انسانوں کو دور رکھیں یا اس کے پاس وہ تمام جواز ہوں گے جو ساتھ رہنے میں رکاوٹ بنے رہیں پس مودت ایک ایسی شے ہے جو الفاظ سے نکل کر ان تمام اعمال میں ڈھل جائے گی جو دو انسانوں میں قرب کا ذریعہ بنُ رہے ہوں اور اعمال کی پہچان نہایت آسان ہے بنسبت محض اقوال کے۔

دوسری وجہ رحمت بیان کی گئی جسکا بنیادی مطلب ہے تکلیف، مشکل یا مصیبت سے بچانا، جو ساتھی ہمیں تکلیف و مشکلات سے دور رکھتا ہے، بچاتا ہے، ڈھال بن جاتا ہے، ہماری زندگی میں اور کاموں میں آسانیاں پیدا کرتا ہے وہی رحمت ہے اور اسی کے برعکس وہ شخص ہوگا جو آپ کو آسانیاں دینے کی بجائے آپ کو ہمیشہ الجھا کر رکھے گا تاکہ آپ کو پہچان کے لیے غور وفکر کرنے کا وقت ہی نہ ملے۔

اور ایسا رحمت و مودت کے اصول پر کار فرما انسان ہی باعث سکون ہے۔ آیت کے آخر میں اللہ نے ہماری رہنمائی فرماتے ہوئے کہا کہ اگر تم غور و فکر کروگے تو تم مودت و رحمت تلاش کر لو گے کیونکہ یہ دونوں خصوصیات انسان کے عمل سے جھلک رہی ہوتی ہیں اور اگر تم نے یہ چیزیں تلاش کر لیں تو تم سکون پا گئے۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سریع الحساب

وہ دونوں میری دکان پر آکر کھڑے ہوئے، نو بیاہتے میاں بیوی

لڑکے کی آنکھوں میں سرمہ
لڑکی کے ہاتھوں پر رنگ چھوڑتی مہندی

ان کی عمریں اور ان کی ہچکچاہٹ بتا رہی تھی کہ ان کی شادی کو زیادہ دن نہیں گزرے۔ ان کا لباس بتا رہا تھا کہ نہایت متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بحثیت دکاندار میرا بیس سالوں کا تجربہ مجھے دعوت دے رہا تھا کہ شکار حاضر ہے، صیاد کمر کس لے۔

کچھ چیزیں جو انھوں نے بتائیں وہ میں نے سیلز مین سے نکلوا کر ان کے سامنے رکھیں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ہمارے محلے میں نئے آئے ہیں، تالے خریدنے سے مجھے پتہ چل گیا کہ کرایے کا مکان لیا ہے، صابن چائے اور واش روم کی چیزیں بتا رہی تھیں کہ یہ ایک دن پہلے ہی یہاں شفٹ ہوئے ہیں، دالوں، چینی اور پتی کا وزن بتا رہا تھا کہ لڑکی کو گھر چلانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور لڑکے کا لباس، اس کی

انگلیاں اور ناخنوں کی حالت نے راز کھولا کہ وہ کسی فیکٹری یا ورکشاپ میں عام سی نوکری کرتا ہے۔

جب وہ اپنی ضرورت کی چیزیں بتا چکے تو میں نے جال بچھانا شروع کیا۔ بہت سی چیزیں تو میں نے یہ کہہ کر بیچ دیں کہ شہر میں سب لوگ یہی استعمال کرتے ہیں، کچھ چیزیں اس لیے ان کو لینی پڑیں کہ ان کی پیکنگ بہت خوبصورت تھی، کچھ اشیاء میں نے یہ ڈرا کر بیچ ڈالیں کہ ابھی اس قیمت میں مل رہی ہیں ہفتے بعد نہیں ملیں گی، کچھ برانڈ جو بہت مہنگی ہوتی ہیں اور کم بکتی ہیں وہ لڑکے کو اس لیے لینی پڑیں کیونکہ وہ نہ لینے سے دلہن کی جلد خراب ہو سکتی تھی اور چند مہنگی چیزیں میں نے لڑکے کو یہ کہہ کر بیچ دیں کہ یہ گھر کی عورت جانتی ہے کہ گھر میں کتنی ضرورت پڑتی ہے اور وہ لڑکی شرم کے مارے نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں نہیں جانتی۔

آخر میں شدید گرمی کے موسم میں خشک میوہ جات کے فوائد، افادیت اور اگلی نسل پروان چڑھانے کی ضرورت نے انھیں وہ بے موسمی چیزیں خریدنے پر بھی مجبور کر دیا۔ آخری حربہ یہ تھا کہ کچھ چیزوں پر میں نے لڑکے کو تیز دلاتے ہوئے کہا وہ ذرا مہنگی ہوتی ہیں پتہ نہیں آپ

لینا چاہتے ہیں یا نہیں تو وہ اپنی نئی دلہن کے آگے شرمندہ ہونے سے بچنے کے کارن لے گیا۔ یوں وہ پانچ ہزار خرچنے کی نیت سے آیا ہوا سادہ سا ہنسوں کا جوڑا میری مہارت کے آگے چاروں شانے چت ہو کر بیس ہزار کی اشیاء کی خرید و فرخت کا شکار ہو گیا۔ رات عشاء کی اذان کے بعد نماز کے لیے جاتے وقت میرے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ دیدنی تھی۔

میں سارا راستہ مسجد جاتے اور آتے وقت واللہ خیر الرازقین کا ورد کرتا رہا کیونکہ اللہ نے مجھے میری توقع سے زیادہ منافع اور آمدن عطا کی تھی۔ گھر جاتے وقت گھر والوں کے لیے کلو جلیبی بھی لیتا گیا۔

گھر آکر کھانا کھایا پھر میٹھے کے طور پر جلیبیاں کھائیں تھوڑی دیر ٹی وی پر ٹاک شو سنے، سونے سے پہلے حسب عادت آیت الکرسی پڑھی اور چاروں قل پڑھ کر پھونک ماری اور سو گیا۔

اگلے دن دکان پر روزمرہ کا معمول تھا، ظہر پڑھ کر دکان پر آیا ہی تھا کہ گھر سے بیگم صاحبہ کا پیغام آیا چھوٹی ثوبیہ کا پیٹ خراب ہے تو دکان سے اسپغول کا چھلکا بھجوا دیں۔ سیلز مین کو چھلکا اور ساتھ سیون اپ

کی بوتل دے کر بھیجا۔ مغرب کے وقت گھر سے دوبارہ فون آیا کہ ثوبیہ کو الٹیاں آ رہی ہیں، دکان سیلز مین کے حوالے کر کے گھر کو روانہ ہوا راستے میں ایک ڈاکٹر دوست کو فون کیا تو وہ بتانے لگا آجکل یہ وبا چل رہی ہے پورے شہر میں، پریشانی کی بات نہیں کلینک پر لے آئیں۔

چیک اپ کے بعد اسے ڈرپ لگا دی گئی، بیگم صاحبہ ہلکی سی آواز میں ورد کرتی رہیں لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین اللہ کا کرم ہوا رات 12 بجے سے پہلے ڈرپ ختم ہو گئی اور کلینک سے بل بنوایا اور گھر آ گئے۔ شام کے بعد سے پیٹ بھی خراب نہیں ہوا اور الٹی بھی نہیں آئی۔ بیشک اللہ شفاء دینے والا ہے۔

صبح معمول کا دن تھا، ثوبیہ کو سکول سے چھٹی کروائی تاکہ آرام کرے اور دکان پر آ گیا۔ دن میں بیگم صاحبہ کو فون کیا خیریت پوچھنے کے لیے تو بتانے لگی کہ ویسے سب ٹھیک ہے بس ثوبیہ کو کمزوری ہو گئی ہے کچھ کھا پی بھی نہیں رہی ذرا ڈاکٹر صاحب سے پوچھیں کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر سے فون پر مشورہ کیا تو اس نے کہا طاقت کے کچھ کیپسول اور ایک چاکلیٹ کے ذائقے والا پاؤڈر لکھ دیتا ہوں منگوا لیں تاکہ جسم میں

طاقت آنا شروع ہو جائے۔ دکان سے لڑکے کو کاغذ پر لکھ کر بھیجا کہ سب کچھ میڈیکل سٹور سے لیکر گھر چھوڑ آئے۔ اگلے کچھ دن میں ثوبیہ بالکل ٹھیک ہو گئی اور سکول جانے لگی۔

کچھ دن بعد نیا مہینہ شروع ہونے والا تھا، دکان کا حساب کتاب کرنے میں مصروف ہوگیا، سارے بل اور تنخواہوں کا حساب لگایا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کے کلینک کی رسید اور میڈیکل سٹور کا پرچہ بھی پڑا تھا۔ ان دونوں کو کیلکولیٹر پر جمع کیا تو ثوبیہ کی بیماری پر بیس ہزار روپے خرچ آیا تھا۔

اِنَّ اللهَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ

بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اور میری تنہائی
اکثر یہ باتیں کرتے ہیں

کچھ جملے جو مجھے بچپن سے پریشان کرتے تھے اور ان کا جو بھی مطب سمجھایا جاتا تھا وہ پریشانی دور کرنے کی بجائے اضافے کا سبب بنتا تھا جیسا کہ

پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الااللہ

میں نے جب مطلب ڈھونڈا تو پتہ چلا کہ پاکستان فارسی زبان کا لفظ ہے جس کا لفظی مطلب ہے پاکیزہ لوگوں کے رہنے کی جگہ اور لا الہ الا اللہ عربی زبان کا جملہ ہے جس کا مطلب ہوا اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے جس کی اتباع کی جائے تو پاکستان کا مطلب دنیا کی کسی بھی زبان کے غلط ترین مفہوم میں بھی وہ نہیں بنتا جو ہمیں بتایا جاتا تھا

اللہ الصمد یعنی اللہ بے نیاز ہے

بے نیازی کا مطلب جاننے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ جب کوئی شخص

کسی کا محتاج نہ ہو بے پرواہ ہو وہ بے نیاز کہلاتا ہے۔ ایک طرف اللہ کہتا ہے وہ الصمد یعنی بے نیاز ہے اور دوسری طرف وہ کہتا مجھے چھوڑ کر کسی اور طرف نہ چل پڑنا، یہ جرم کبھی نہیں بخشوں گا۔ اگر اسے کسی چیز کی پرواہ اور محتاجی نہیں ہے تو اسے کیا فرق پڑتا کہ لوگ کسے پوجتے یا مانتے ہیں اور اگر اسے فرق پڑتا ہے تو بے نیاز نہ ہوا۔

الو دا پٹھا

ایک دفعہ کچھ غلطی کرنے پر بچپن میں والد مرحوم نے مجھے الو دا پٹھا کہا، پہلی دفعہ میں نے یہ لفظ سنا تو دادی سے پوچھا کہ یہ الو دا پٹھا کیا ہوتا ہے انھوں نے سمجھایا جو کام ٹھیک طریقے سے نہ کرے یا غلطیاں کرے تو ڈانٹنے کے لیے الو دا پٹھا کہتے ہیں۔ میں نے الو کے چھوٹے بچے کو غور سے دیکھا تو وہ نہایت معصوم، نرم و ملائم اور سمجھدار آنکھوں والا نظر آیا، میں بچپن میں بہت حیران رہا کہ الو کا پٹھا کسی منفی معنوں میں کیوں استعمال ہوتا ہے؟

بسم اللہ

بچپن سے پڑھایا گیا ہر کام کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنی ہوتی ہے، کچھ

شرارتی سے سوالات پوچھے کہ فلاں کام سے پہلے بھی پڑھنی ہے تو پتہ چلا کہ صرف نیک اور اچھے کاموں میں بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ گھر میں دادی اماں تھیں اور ہم چھ بچے، جب کوئی گر جاتا تو دادی پیار سے کہتیں بسم اللہ اور زیادہ تر گھروں میں ایسا ہی ہے، میں سوچا کرتا تھا گرنا تو کوئی اچھا کام نہیں ہے اس پر بسم اللہ کیوں پڑھتے ہیں، کچھ لوگوں سے پوچھا تو خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ پھر اس کا ترجمہ ہمیں بتایا گیا تھا شروع کرتا ہوں تو گرنے پر بسم اللہ پڑھنے کا مطلب کچھ مضحکہ خیز لگتا تھا۔ پورا ترجمہ پڑھا تو اور زیادہ پریشانی ہوئی یعنی اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے۔۔۔

ٹوپی والا برقع

ہماری دادی اماں ٹوپی والا برقع پہنا کرتی تھیں، ایک دفعہ ان سے پوچھا تو کہنے لگیں کہ گھر کے باہر کے لوگوں کو کچھ نظر نہیں آنا چاہیے، یہ بے حیائی ہوتی ہے، تھوڑا بڑا ہوا سکول میں اساتذہ سے پردے کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے کہ عورتوں کے نقش و نگار دیکھ کر مرد متوجہ ہوتا ہے اور اسے شہوت محسوس ہوتی ہے اس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے اس لیے عورت کو حکم ہے کہ وہ اپنا آپ چھپائے۔ میں

سوچتا تھا ٹوپی والا برقع پہن کر یا نقاب لیکر عورت تو چھپ جاتی ہے مگر اس عورت کو ارد گرد سارے مرد پوری طرح نظر آرہے ہوتے ہیں، مردوں کے بال، چہرہ، گردن، چھاتی اور ٹانگیں بھی۔ عورت بھی تو مرد کی وجاہت کی طرف متوجہ ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے تو اس سے بھی معاشرے میں پچاس فیصد بگاڑ تو پیدا ہو گیا، یہ اللہ نے کیوں ایسا نظام بنا دیا جو صرف آدھے معاشرے کو ٹھیک کرے گا اور باقی آدھے کو پورا موقع دے گا؟

جب یہ سوال ذہن میں آیا کرتے تھے تب جواب ڈھونڈنے کے ذرائع بہت محدود تھے، جواب جاننے والے لوگ بھی میسر نہیں تھے اور گوگل ابھی اپنی پشتوں کی صلب میں پرورش پا رہا تھا تو جواب نہیں ملتے تھے

پھر بھی سکون تھا، کوئی بے چینی نہیں تھی۔

اب وقت، تجربے اور مطالعہ نے جواب دے دیے ہیں تو بے چینی بھی ہے، شاید ایسے ہی موقع کے لیے علامہ اقبال نے کہا تھا

آگہی عذاب ہے

دو کٹہرے

علم نفسیات کے مطابق ہر انسان اپنے دماغ میں دو کٹہرے بناتا ہے۔

پہلا کٹہرا وہ اپنے لیے اور اپنے پسندیدہ لوگوں کے لیے بناتا ہے جس میں وہ اپنے ہر عمل، سوچ اور اپنے پسندیدہ لوگوں کے عمل اور سوچ کو کھڑا کرتا ہے، ان پر سوال و جواب ہوتے ہیں، غلط اور صحیح کا فرق کیا جاتا ہے اور کچھ بھی غلط ثابت ہونے پر اس کو سزا کے طور پر نکال باہر کیا جاتا ہے۔

اسی طرح دوسرے کٹہرے میں اپنے آپ اور اپنے پسندیدہ لوگوں کے علاوہ ہر انسان اور چیز کو رکھا جاتا ہے اور ان سب کو بھی اسی امتحان سے گزار کر پرکھا اور سزاوار کیا جاتا ہے۔

فرق اتنا ہے کہ پہلے کٹہرے کا جج بھی وہ خود ہوتا ہے اور دونوں طرف کا وکیل بھی خود۔ اس لیے ہمیشہ ہم اور ہمارے پسندیدہ لوگ اور کام، سب کو باعزت بری کر دیا جاتا ہے جبکہ خلوص پر تاحیات پابندی، قطع تعلق کی قید با مشقت اور الزامات کی سولی جیسی سزائیں فقط دوسرے کٹہرے سے سننے میں آتی ہیں۔

خدا ہی حافظ

سر! مجھے ہر کوئی کہتا ہے میرا دماغ خراب ہے ، میں پاگل ہوں، تم مرو گی تو ہماری جان چھوٹے گی۔ کیا واقعی میرا کوئی علاج نہیں ہے؟

سوال سن کر مجھے افسوس ہوا کہ ہم کیسے انسان ہو گئے ہیں، کیسے ہم کسی انسان کی تذلیل کر کے خود کو اچھا محسوس کروا سکتے ہیں، کیسے نیند آجاتی ہے ہمیں اتنی بڑی بڑی باتیں بول کر، خیر میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے ہر مرض کی شفا بنائی ہے بس صحیح تشخیص اور صحیح علاج کی ضرورت ہے۔ آپ بھی تو علاج کے لیے سائکاٹرسٹ کے پاس جا رہی ہو، اللہ کرم فرمائے گا۔

"اللہ کرم فرمائے گا" اس نے میرا جملہ دہرایا، بے یقینی کی حالت میں اور بولی

"سر ! خود کشی کی اجازت کس کس صورت حال میں ہے؟"

اس سوال کا جواب دینے کے لیے مجھے سوچنا پڑا، اگرچہ جواب مجھے معلوم تھا اور فوراً دیا بھی جا سکتا تھا مگر سوال کرنے والے کی حالت کو سامنے رکھنا ضروری تھا، ایسا جواب نہیں دینا تھا کہ وہ فون بند کرتے ہی خود کشی کر لے۔

اس کی کال کا آغاز ہی دھماکے دار تھا، اس نے دعا سلام کے بعد پہلی بات ہی یہ کہی

"سر کیا موت کا کوئی ذائقہ ہوتا ہے؟" یہ جو قرآن میں لکھا ہے کہ قل نفس ذائقہ الموت' ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے

بیٹا، ذائقہ ایک سائنسی عمل ہے، سائنس کے مطابق ایک ہی چیز کا ذائقہ ہر انسان کی زبان پر سو فیصد ایک جیسا ہونا تقریباً نا ممکن ہے، اسی سائنس کے مطابق اللہ تعالٰی نے موت کو بھی ذائقہ کہا ہے کیونکہ اس میں سے گزرنے کا جسمانی اور عقلی تجربہ ہر انسان کا مختلف ہوگا۔

"سر! اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ مرنے کے بعد کوئی اگلی زندگی ہے بھی یا نہیں؟ کیونکہ آج تک کسی نے دیکھا نہیں جو دیکھتا ہے وہ بتانے

واپس نہیں آیا"

دیکھو بیٹا آپ پیدا ہونے سے پہلے 9 ماہ تک ماں کے پیٹ میں تھی، آپ سن سکتی تھی، محسوس کر سکتی تھی، آپ کا دل دھڑکتا تھا، آپ اندر ہاتھ پاؤں مارتی تھی، ایک دو دن نہیں، 9 ماہ مگر آپ کو ایک لمحہ بھی یاد نہیں، پس ایک زندگی آپ خود گزار کر آئی ہو اور آپ کو یاد نہیں ہے پھر بھی یقین ہے کہ ایسی ایک زندگی موجود بھی ہے اور آپ نے خود گزاری بھی ہے تو اسی طرح آگے والی زندگی بھی ہے کیونکہ جس خالق کائنات نے ہمیں ان پچھلی دو زندگیوں کے بارے میں بتایا ہے اسی خالق نے اگلی زندگی کا وعدہ بھی کیا ہے۔

"سر! اگر میں کسی کے بغیر نہیں رہ سکتی اور وہ اب میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تو میں کیا کروں؟"

جب انسان اس حالت میں خود کو لے جاتا ہے کہ کسی کے بغیر رہ نہ سکتا ہو اور یہ بات اس شخص کو معلوم بھی ہو تو پھر آپ کچھ نہیں کر سکتے، پھر تو وہ کرے گا جس کو آپ نے اتنا بڑا ہتھیار تھما دیا ہے اب اگر وہ اچھا انسان ہے تو اتنے بڑے اختیار کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گا

اور اگر وہ اچھا انسان نہیں ہے تو پھر وہ اس اختیار کو ہتھیار بنا کر آپ کا استحصال کرتا رہے گا۔

ہاں سر، آپ نے ٹھیک کہا میرا تو کافی عرصے سے استحصال ہوتا رہا ہے اور میں آنکھیں بند کر کے وقت گزار رہی تھی کہ شاید سب کچھ ٹھیک ہو جائے مگر۔۔۔

اس کی طرف سے کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولی

"سر ملک کے حالات کیوں بہتر نہیں ہو رہے، کیوں ہمارے حکمران اتنے کرپٹ ہیں اور عوام کی زبوں حالی ان کو نظر کیوں نہیں آتی، سیاستدان کب سدھریں گے؟"

اس بیچاری کی ذہنی حالت ایسی ہی تھی جس کی وجہ سے لوگ اسے پاگل سمجھتے تھے، اب وہ اپنی زندگی کے اہم ترین موضوع پر بات کرتے کرتے اچانک ملکی حالات کی جانب چلی گئی مگر مجھے معلوم تھا ایسا وہ جان بوجھ کر نہیں کرتی تھی، سائیکالوجی کے مطابق ذہنی انتشار میں ایک ایسی حالت ہو جاتی ہے جس سے انسانی دماغ میں خیالات بے ترتیبی

سے نمودار ہوتے ہیں اور انسان خود بھی یاد نہیں رکھ پاتا کہ وہ کس موضوع پر بات کر رہا تھا۔ سائیکالوجی پڑھنے پڑھانے والے لوگ اسے Dissociative Amnesia کہتے ہیں۔ خیر میں نے جواب دیا تاکہ وہ موضوع پر خود ہی واپس آ جائے۔

بیٹا میں اس عمومی سیاست پر گفتگو نہیں کرتا ہوتا۔

سر! جس سے بھی مشورہ کیا یا بات کی ہے وہ کہتا ہے پریشان مت ہو، ٹینشن نہ لو اللہ بہتر کرے گا، اللہ نے کچھ بہتر کرنا ہوتا تو آج میں اس حالت میں نہ ہوتی، مجھے نہ بہتری کی کوئی امید رہ گئی ہے اور نہ زندہ رہنے کا شوق، میرے ساتھ تو اللہ نے بھی اچھا نہیں کیا یہ کہتے ہوئے وہ ہنس پڑی، ایسی ہنسی جسے انسان ہونٹوں سے تو ہنستا ہے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوتے ہیں۔

بیٹا اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا، ہاں لوگ اپنے ساتھ خود زیادتی کرتے ہیں اور پھر اس زیادتی کا مکافات ان تک پہنچتا ہے۔

ہاہاہا۔۔۔یہ بھی ٹھیک ہے اللہ جو مرضی کر لے تو قصور بندے کا ہے اور بندہ جب تنگ آکر کچھ کرے تو وہ بھی بندے کا قصور ہے، ویسے

سر میرا بندہ بھی اللہ جیسا ہے وہ بھی ایسا ہی سو چتا ہے۔
مجھے اس کی بات سن کر تکلیف ہوئی، میرا دل چاہا کہ میں اس کے الفاظ اور ایمان کی اصلاح کروں مگر شاید یہ موقع مناسب نہیں تھا، بقول واصف علی واصف صاحب کسی کی مدد کرتے وقت اس کا عقیدہ نہیں پوچھا کرتے۔ میں نے کسی اور انداز سے سمجھانے کی کوشش کی۔

آپ تحمل سے سوچو کہ جس انسان کی وجہ سے آج آپکی یہ حالت ہے۔ کہ آپ کا جینے کو دل نہیں کر رہا اور آپ کو اللہ کی رحمت پر شک ہو رہا ہے وہ انسان بھی آپ کا ہی انتخاب تھا، کسی بھی مسئلے کی تہہ تک جاننے کی کوشش کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اصل قصور انسان کا اپنا ہی ہوتا ہے، جو لوگ ہمارا نقصان کر جاتے ہیں وہ یا تو ہمارا ہی انتخاب ہوتے ہیں یا ہماری بلاوجہ خاموشیوں کی سزا۔

سر میں یہی تو کہہ رہی ہوں کہ اللہ کا تو کوئی قصور بنتا نہیں کسی بھی صورت نہ میرے بندے کا، آخر میں، میں ہی مجرم نکلوں گی اور سزا صرف مجرم کو ہی ملنی چاہیے۔ سر ! خود کشی کی اجازت کس کس صورت حال میں ہے؟
بیٹا اللہ نہ کرے کہیں عورت کی عزت کو خطرہ ہو یا یقین کامل ہو کہ

دشمن کے ہاتھوں بہت اذیت ناک موت واقع ہونے والی ہے تو ایسی صورتحال میں ہی گنجائش نکل سکتی ہے ورنہ حد درجہ انسان کو کوشش کرنی چاہیے ایسی صورتحال سے نکلنے کی بھی اور اس فعل سے بچنے کی بھی۔

وہ میری بات سن کر کچھ دیر خاموش ہو گئی، میں منتظر رہا کہ وہ کچھ بولے گی، کافی دیر تک آواز نہیں آئی۔ میں نے دو بار وقفے سے موبائل کی سکرین دیکھی تو کال ابھی تک جاری تھی۔

کیا آپ لائن پر ہو؟

"جی سر میں لائن پر ہوں"

یہ کہہ کر وہ ہنسی اور اس نے فون منقطع کر دیا۔ مجھے گمان ہوا کہ کہیں وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔ اصل میں پرانے مذاہب خود کشی کو مذہبی جرم قرار دیتے رہے ہیں جس کے باعث عوام اس فعل کے بارے میں نہ بات کرتی ہے نہ ان کے بڑے ان کو بتاتے ہیں۔ ہم سب یہ سوچ کر کچھ سوچتے ہی نہیں ہیں کہ یہ حرام ہے۔ تھوڑا سا سوچنے، غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر جینے کا خواہشمند ہے، مرنے کا نہیں، انسان کو مرنا بالکل پسند نہیں ہے اسے

ایسا لگتا ہے کہ اگر وہ مر گیا تو اس کی پسندیدہ فلم اچانک یہیں ختم ہو جائے گی، سب رنگینیاں یہیں رہ جائیں گی اور بس اس اکیلے کو باہر نکال دیا جائے گا، اسے لگتا ہے ابھی بہت سے کام ہیں جو اسے کرنے، کروانے اور دیکھنے ہیں ابھی وہ کیسے مر سکتا ہے۔ پس انسان کو مرنا پسند نہیں ہے تو پھر کوئی خود سے کیوں مرنا چاہے گا، جو خود کو مارلیتا ہے وہ اس بے گناہ کی طرح ہے جسے جلاد کے ہاتھوں پھانسی دے دی جاتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خود کشی کرنے والا اپنا جلاد بھی خود بن جاتا ہے۔ کسی بے گناہ کو پھانسی کے پھندے تک لانے والے بہت سے افراد ہوتے ہیں جو اپنی اپنی جان بچانے، مال بچانے، ظاہری عزت یا وقت بچانے کے چکروں میں کسی بے گناہ کو بلی چڑھا دیتے ہیں۔ خود کشی والے کے پیچھے بھی بہت سے خاموش قاتل ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی تو اپنی ذمہ داری نہیں نبھا رہا ہوتا اور کوئی اسے اپنی ذمہ داری سمجھتا ہی نہیں ہے۔ کسی کے پاس خود کشی کرنے والے کو سنانے کے لیے صرف طعنے اور تکلیف دہ جملے ہوتے ہیں اور کسی کے پاس اسے سننے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ الغرض خود کشی کرنے والا اگر دماغی امراض کا شکار نہیں تو حالات کا شکار ضرور ہوتا ہے اور حالات ہمیشہ ارد گرد کے افراد سے پیدا ہوتے ہیں۔ سائیکالوجی کے مطابق ہر نشہ کرنے والا انسان بھی خود کشی کر رہا ہوتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نشہ

اسے چند سالوں میں ختم کردے گا مگر وہ پھر بھی جاری رکھتا ہے۔
مجھے کچھ خدشہ محسوس ہوا، میں نے اس کے بھائی کو کال ملائی تو نمبر بند جا رہا تھا۔ پھر اس کی بڑی بہن کو کال ملائی تو کافی دیر تک کرونا کی معلومات والی آڈیو چلتی رہی مگر اس نے کال نہیں لی۔ تیسری کال میں نے اس کی ایک قریبی دوست کو ملائی تو اس سے بات ہو گئی۔ میں نے جب مریضہ کی حالت بیان کی تو کہنے لگی مجھ سے بہتر اسے کوئی نہیں جانتا پندرہ سالوں کا تعلق ہے ہمارا، وہ صرف ڈرامے کرتی ہے اوور ایکٹنگ کرتی ہے۔ ہمدردیاں لینے کے لیے، سر قسم اٹھوا لیں اسے کوئی مسئلہ نہیں ہے اسے سب کی توجہ چاہیے سب اسی کی باتیں کریں اور بس اسی کی بات مانیں، اب کسی کو بھی اس کی باتوں پر یقین نہیں رہا، میری سمجھ سے باہر آپ کیسے اس پاگل، سائیکو کیس کو برداشت کرتے ہیں۔ خدا حافظ
اگلے دن ایک سرکاری ہسپتال کے کمرہ انتظار سے اس کی بہن نے مجھے کال بیک کی، ضروری سلام دعا کے بعد آخری اہم الفاظ یوں تھے
اس کا دماغ خراب ہے، وہ پاگل ہے، وہ مرے گی تو ہماری جان چھوٹے گی۔ اسکا کوئی علاج نہیں ہے اور آپ کو پہلے بھی کہا تھا خدا کے واسطے اس کی باتوں میں نہ آیا کریں، آپ سن لیتے ہیں اور ہم سب کو برا بنا دیتے ہیں، خدا حافظ۔

فیصلہ روز سنایا جا رہا ہے

البرٹ کیمس نے کہا تھا
میرے دوستو، میں تمھیں ایک بہت گہرا راز بتانا چاہتا ہوں، وہ راز یہ ہے کہ آخری فیصلے کے دن کا انتظار مت کرو کیوں کہ فیصلہ روز سنایا جا رہا ہے۔
قرآن کا ادنیٰ سا طالب علم ہونے کے فیض سے میرا بھی یقین کامل ہے کہ فیصلہ روز سنایا جاتا ہے، انعام روز بانٹے جاتے ہیں اور سزائیں بھی روز جاری کی جاتی ہیں ۔
اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ
"میں بہت جلد حساب کر کے فیصلہ کرنے والا ہوں"

جیسے ہمیں دنیا کی تیز ترین کار، ٹرین، موٹر سائیکل اور تیز ترین انسان کا پتہ ہے اور یقین ہے کہ وہ اپنے اپنے کام دنیا کے باقی تمام افراد اور چیزوں سے پہلے کر لیتے ہیں تو خدا کے اس دعوے پر یقین کیوں نہیں ہوتا؟
یعنی اللہ تعالیٰ فوراً فیصلہ فرمائے گا اور بدلہ پہنچا دیا جائے گا، نہ قطار نہ انتظار، نہ دعا کی محتاجی نہ عبادات کا مسکہ نہ وظائف کا تکلف نہ اذکار

کی رشوت، نہ امیر و غریب کی تمیز، نہ عرب و عجم کا فاصلہ، صرف عمل اور صرف نتیجہ، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ فیصلہ روز سنایا جا رہا ہے۔

کتنا آسان ہے نہ کسی مفتی سے فتویٰ لینے کا محتاج بننا نہ کسی مولوی سے مشورہ کرنے کا، نہ پیر صاحب کی اجازت درکار ہے نہ مجتہدین کا استفتاء۔

بس ایک طرف بارگاہ الٰہی اور سامنے بندہ ناچیز، بیچ میں نہ کوئی بندہ نہ کوئی پردہ، کیا دنیا کا کوئی پیغمبر آپ نے ایسا دیکھا، کیا کسی صحابی یا امام کا دعویٰ سنا ہو، لوگوں نے اتنی حدیں پار کر دیں کہ خود کو خدا، تو کبھی نبی اور ولی کا تمغہ پہنانے کی کوشش کی مگر کسی نے آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ دعویٰ کرنے والے کو ثبوت دینا پڑنا تھا اس لیے دعویٰ کرنے کی جرات ہی نہ ہوئی۔

وہ جمال میں فرماتا ہے تم ایک نیکی کرو میں تمھیں سات، ستر اور سات سو گنا اجر دے دوں گا اور ایک غلطی کرو گے تو ایک ہی غلطی گنوں گا یعنی دیتے وقت بے حساب دے دینا اور لیتے وقت صرف حساب کے مطابق لینا۔ مگر فیصلہ بتا دیا ہے انتظار نہیں کروایا۔ فیصلہ روز سنایا جا رہا ہے۔

جلال میں فرماتا ہے اگر تم پر میری کسی بات کا، نصیحت کا، بار بار سمجھانے کا، قصوں سے ہدایت دینے کا، جنت کے انعامات کا اور جہنم کی سختیوں کا بھی اثر نہیں ہو رہا تو جاؤ پھر تمھاری رسی ڈھیلی چھوڑ دی ہے، تم نے اپنے دلوں پر مہریں لگوا لی ہیں، تم نہ سنتے ہو نہ دیکھتے ہو نا عقل سے کام لیتے ہو اس لیے تم جانوروں سے بھی بد تر ہو۔ یہ بھی فیصلہ ہے جو پہلے سے اعلان شدہ ہے، کسی عدالت کے لگنے کا اور گواہوں کی قسموں کا انتظار نہیں کروایا، چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ فیصلہ روز سنایا جا رہا ہے

امریکہ میں کالوں کو غلام بنا کر نہایت بدسلوکی کی جاتی تھی، ان کے پاس تعلیم و صحت جیسی بنیادی سہولیات بھی نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی ان کو حاصل کرنے کا کوئی حق۔ پھر ایک انسان اٹھا اس نے اپنی ذاتی جدو جہد سے امریکہ میں کالے گورے کی تمیز ختم کر کے رکھ دی، کہتے ہیں اگر وہ شخص نہ آتا تو آج بھی امریکہ دنیا کی بدترین آبادیوں میں سے ایک ہوتی۔ اس کا نام مارٹن لوتھر کنگ تھا۔ وہ انسان تھا، عام انسان بس وہ خدا کے راز کو جان گیا، خدا گورے اور کالے کو ایک جیسے خواب دکھاتا ہے، دونوں کے اعضاء ایک جتنے اور ایک جیسے بناتا ہے دونوں کی رگوں میں سرخ خون دوڑاتا ہے دونوں کو اولاد، بارش، ہوا، پانی، آکسیجن، عقل و شعور، زندگی اور موت بھی دیتا ہے، کسی

کی عمر رنگت کی بنیاد پر بڑھ نہیں سکتی نہ کسی کی عمر غربت کی بنیاد پر کم ہوتی ہے، وہ جان گیا اور لوگوں تک یہ راز پہنچا گیا۔ اس کا ایک مشہور قول ہے

A justice delayed is a justice denied

جو انصاف دیر سے ملے وہ انصاف نہیں، نا انصافی ہے۔ انسان ہو کر سمجھ گیا خدا کی تقسیم اور عادت کو، پھر خدا خود خدا ہو کر کیسے دیر کر سکتا ہے، ہر گز نہیں کیونکہ فیصلہ روز سنایا جا رہا ہے۔
اسی خدا کا کچھ خوف کریں، لمبے فیصلوں پر یقین انسان میں تبدیلی نہیں پیدا ہونے دیتا، انسان کو امید لگی رہتی ہے کہ ابھی وقت ہے، ابھی میں فلاں کام ختم کر لوں پھر لازماً اس کی طرف رخ کروں گا، پھر لوگوں سے بھی معافی مانگ لوں گا، خدا سے بھی سب بخشوا لوں گا مگر خدا اس سے مدت قبل فیصلہ سنا چکا تھا، مہر لگ چکی تھی، یہ بعد کے فیصلوں والی امید ہی تو مہر ہے جو سچ سامنے ہوتے ہوئے بھی فوری قبول اور اصلاح نہیں کرنے دیتی کیونکہ فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے، فیصلہ کرنے والا انتظار نہیں کر رہا کیونکہ وہ دلوں کے بھید جان کر فیصلہ کرتا ہے اور فوری کرتا ہے۔

غالباً ایسے ہی کسی شعوری مقام پر پہنچ کر علامہ اقبال نے ہماری رہنمائی کے لیے لکھا تھا کہ

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بچوں کی تربیت کیسے کی جائے

بچے وہ کرتے ہیں جو وہ دیکھتے ہیں
انسانی نفسیات کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہونے کے ناطے اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ بچوں کی تربیت کیسے کی جائے؟
سادہ سا کلیہ ہے جسے یاد رکھنا بھی آسان ہے بچے وہ کرتے ہیں جو وہ دیکھتے ہیں۔

دوبارہ غور کریں اس جملے پر یہ سادہ سا جملہ نہایت اہمیت کا حامل ہے بچے وہ کرتے ہیں جو وہ دیکھتے ہیں۔

بچے وہ نہیں کرتے جو آپ انھیں بتاتے ہیں یا سمجھاتے ہیں۔ اکثر والدین جو اپنے بچوں کو سمجھا سمجھا کر فرسٹریٹ کر چکے ہوتے ہیں وہ مجھے کہتے ہیں ذرا ہمارے بچوں کو بھی اچھا سا سمجھا دیں۔

پس آپ بچوں کو جو بنانا چاہتے ہیں وہ دکھانا شروع کر دیں۔ بچے کا سارا دن کہاں گزرنا ہے، اس نے کون کونسی جگہ جانا اور کس کس انسان سے ملنا ہے، یہ سب ابتدائی 15 سالوں تک والدین کے اختیار

میں ہوتا ہے تو اگر آپ کا بچہ کچھ بھی غلط سیکھ رہا یا کچھ بھی ٹھیک نہیں کر رہا تو سمجھ جائیں کہ اس کے 24 گھنٹوں میں کوئی فرد موجود ہے جسے وہ ایسا کرتے دیکھتا ہے۔ آغاز تو والدین سے اور گھر کے ماحول سے ہی ہو جاتا ہے تو آپ اپنی بیوی یا خاوند کے ساتھ کیسے ہیں، اگر گھر میں کوئی بزرگ رہتا ہے تو ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں،
آپ گھر میں ٹی وی پر کیا دیکھتے ہیں، بچے موبائل یا کمپیوٹر پر کیا دیکھتے ہیں، سکول میں اساتذہ کیا کرتے ہیں جب وہ پڑھا نہیں رہے ہوتے۔ یہ سب مل کر بچوں کا مزاج طے کرتا ہے۔ اور بچوں کا مزاج والدین کی توجہ اور تربیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

تربیت کا تعلق کس چیز سے ہے اسے سمجھنے کے لیے نہایت آسان مثال ہے

ہالی وڈ کے ایک بڑے مزاحیہ اداکار نے اپنی زندگی کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے۔

بچپن میں ایک بار میں اپنے والد کے ساتھ سرکس دیکھنے گیا، سرکس کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے قطار میں کھڑے تھے۔ ہم سے آگے ایک فیملی تھی، جس میں چھ بچے اور ان کے والدین تھے، یہ لوگ دیکھنے میں خستہ حال تھے، ان کے بدن پر پرانے، مگر صاف ستھرے کپڑے تھے، بچے بہت خوش تھے اور سرکس کے بارے میں باتیں کر رہے

تھے، جب ان کا نمبر آیا، تو ان کا باپ ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور ٹکٹ کے دام پوچھے، جب ٹکٹ بیچنے والے نے اسے ٹکٹ کے دام بتائے، تو وہ ہکلاتے ہوئے پیچھے کو مڑا اور اپنی بیوی کے کان میں کچھ کہا، اس کے چہرے سے اضطراب عیاں تھا۔

تبھی میں نے اپنے والد کو دیکھا کہ انھوں نے اپنی جیب سے بیس ڈالر کا نوٹ نکالا، اسے زمین پر پھینکا، پھر جھک کر اسے اٹھایا اور اس شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: جناب! آپ کے پیسے گر گئے ہیں، لے لیں۔

اشک آلود آنکھوں سے اس شخص نے میرے والد کو دیکھا اور کہا: شکریہ محترم!

جب وہ فیملی اندر داخل ہوگئی، تو میرے والد نے میرا ہاتھ پکڑ کر قطار سے باہر کھینچ لیا اور ہم واپس ہوگئے، کیوں کہ میرے والد کے پاس وہی بیس ڈالر تھے، جو انھوں نے اس شخص کو دے دیے۔

اس دن سے مجھے اپنے والد پر فخر ہے، وہ منظر میری زندگی کا سب سے خوب صورت شو تھا، اس شو سے بھی زیادہ، جو ہم اس دن سرکس میں نہیں دیکھ سکے۔

اور تبھی سے میرا یہ ماننا ہے کہ تربیت کا تعلق عملی نمونے سے ہے، محض کتابی نظریات سے نہیں۔

یہ مشہور اداکار چارلی چیپلن تھے۔ چارلی کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں ، چارلی وہ پہلا اداکار تھا جسے ٹائم میگزین نے اپنی زینت بنایا۔ چارلی ایکٹر ہونے کے علاوہ ایک اچھے میوزیشن اور ایک اعلیٰ کمپوزر بھی تھے۔ چارلی نے خود ایک یتیم خانے میں پروان چڑھنے کے باوجود اتنی محنت کی اور ایک وقت ایسا آیا کہ ان کے پاس امریکہ کے صدر سے زیادہ دولت ہوا کرتی تھی۔ پوری دنیا کو بغیر بولے ہنسانے والا یہ مسیحا 25 دسمبر 1977 کو سوتے میں پرسکون انداز سے اس دنیا سے چلا گیا۔

چارلی کی بہت سی باتیں اور اقوال مشہور ہیں، چارلی اپنے گیارہ بچوں کو ایک پیغام بار بار دیتے تھے اور عملی طور پر بھی زندگی ایسے ہی گذاری

زندگی میں سادگی حاصل کرنا ایک مشکل ترین کام ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دو غلاف

عربی زبان میں غلاف کا مادہ یعنی

Root Word

غلف ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کسی اصل شے کو ڈھانپنے یا چھپانے کے لیے اس کے اوپر ایک پردہ یعنی غلاف ڈال دینا۔ اس کی چند مثالیں جو عربی ادب میں دی جاتی ہیں وہ کچھ اس طرح سے ہیں

تلوار کو نیام چڑھا دینا غلف ہے

انڈے کا بیرونی چھلکا غلاف ہے

اصل بات کو جھوٹ کے پردے میں ڈالنا غلاف ہے

آپ غور کریں تو یہ غلاف کہیں بھی مثبت معنی نہیں پیدا کر رہا بلکہ ہر دفعہ کسی شے کی اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے، کسی اہم شے کو نظروں سے اوجھل کرنے یا بدل کے رکھ دینے کے مترادف ہے۔ ان مطالب پر غور و فکر کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قرآن پر غلاف چڑھانا کہیں سے بھی کوئی مثبت یا با مقصد عمل نظر نہیں آتا اور قدرے تنقیدی نقطہء نظر سے دیکھیں تو لگتا ہے اس اہم ترین پیغام کو چھپانے، نظروں سے دور رکھنے یا اس تلوار کو ہمارے نفس کو کاٹنے سے روکے رکھنا بھی ایک مکر ہو سکتا ہے۔

کچھ علمی افراد سے گفتگو کرنے سے کوئی منطقی جواب تو حاصل نہ ہوا، جو ایک معمولی سا جواب ملتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کو مٹی، گندگی سے بچانے اور پہچان دینے کے لیے غلاف کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مجھے اس جواب پر حیرانی ہوتی ہے کہ اگر کوئی کتاب دن میں ایک دفعہ بھی کھولی جائے تو اس پر مٹی کیسے جم سکتی ہے۔
کہیں کوئی یہ چاہ تو نہیں رہا تھا کہ اسے روزانہ کھولا ہی نہ جائے؟
گھر میں جتنے افراد ہوں اتنے ہی برتن، بستر اور الگ الگ لباس رکھے جاتے ہیں اور کبھی کبھار آنے والے مہمانوں کے لیے بھی ایک الگ کمرہ، کچھ الگ برتن اور باقی لوازمات بھی سارا سال الگ سے سنبھال کر رکھے جاتے ہیں مگر ننانوے فیصد گھرانوں میں پانچ سے سات افراد کے لیے بھی ایک ہی قرآن ہوتا ہے یا اس سے بڑے گھروں میں زیادہ سے زیادہ دو عدد قرآن۔ کہا جاتا ہے سونا تو سب نے ایک ساتھ ہوتا ہے اور کھانا بھی سب نے ایک ساتھ ہوتا ہے اس لیے گھر میں بستر اور برتن زیادہ رکھے جاتے ہیں، میں نے کہا یہ مناسب بات ہے، میں اس ضرورت اور افادیت سے متفق بھی ہوں ایسا ہی ہونا چاہیے مگر کیا کبھی ہمارے گھروں میں مل بیٹھ کر قرآن کو پڑھنے اور اسکے مختلف موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کرنے کو نوبت پیش آئی؟ ہر گز نہیں ایسا آپ نے بھی کہیں دیکھا سنا نہ ہوگا اور اس کی وجہ دو غلاف ہی

ہیں ایک وہ غلاف جو قرآن کے اوپر چڑھا ہوا ہے اور دوسرا غلاف جو قرآن نے ہمیں سمجھایا ہے۔
البقرہ کی آیت 88 میں جو لوگ اللہ کی آیات کو نہیں مانتے، اس پیغام پر عمل نہیں کرنا چاہتے ان کے الفاظ کچھ اس طرح سے مذکور ہیں

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ
وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں

غور کیجیے اس پیغام پر عمل نہ کرنے کی صورتحال کو غلاف سے تشبیہ دی جا رہی ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں دو دفعہ استعمال ہوا ہے اور دونوں دفعہ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں آپ ہمیں یہ قرآن سنائیں یا نہ سنائیں ہم اس کو سمجھنے یا عمل کرنے والے نہیں ہیں کیونکہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں۔ پس قرآن نے بھی اس لفظ کو کسی مثبت صورتحال یا مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔
آئیے مل کر غور کرتے ہیں کہ ہمارے گھروں اور ہمارے دلوں میں کون سے غلاف ہیں، اگر ایک غلاف نظر آئے تو فوراً اصلاح کر لی جائے اور اگر دونوں غلاف موجود ہوں تو توبہ کا مقام ہے۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سیرو فی الارض

ترجمہ :ہماری زمین میں گھوم پھر کر دیکھو

میں قرآن کی اس آیت پر اکثر غور کرتا اور حیران ہوتا تھا۔ عام طور پر پوری دنیا میں سیرو سیاحت کو ایک عیاشی سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس پر ڈھیر سارے اخراجات بھی آتے ہیں تو عجیب لگتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کیسے ایسا حکم ارشاد فرما سکتا ہے جس میں لوگوں کا بے جا خرچ ہوتا ہو اور سفر کے دوران سارا وقت انسان اپنے روزمرہ کے معمولات اور ذمہ داریوں سے دور بھی رہتا ہو۔

ایک بین الاقوامی سفر کے دوران میں نے اس آیت پر غور کرنے اور اس کے راز کو سمجھنے کی نیت ٹھان لی اور راز افشاء ہو گیا، گرہ کھل گئی۔

گھر سے گاڑی نکالی اور لاہور ایئرپورٹ پہنچا تو ایئرپورٹ میں داخلے پر کھڑے سپاہی نے مجھے روکا اور پوچھا، میں نے اپنی فلائٹ کا بتایا اس نے مجھے اندر جانے دیا۔ وہاں کافی سارے نمائندے موجود تھے جو مختلف قطاروں میں آنے والی گاڑیوں سے یہی سوال پوچھنے اور ضرورت پڑنے پر ان کی تلاشی بھی لے رہے تھے۔ آگے پارکنگ گیٹ تھا جہاں

پھر ایک نوجوان لڑکا بیٹھا گاڑیوں کو پارکنگ کارڈ دے رہا تھا اور اس طرح کے بھی 7 سے زیادہ بوتھ تھے جن میں مختلف جوان لوگوں کی خدمت میں مصروف تھے۔ پارکنگ کے اندر گیا تو وہاں بھی کچھ جوان صفائی کر رہے تھے، کوئی لوگوں کو راستہ بتا رہا تھا اور کوئی سیکیورٹی میں مصروف تھا۔ ایسے ہی کچھ لوگ ٹرالی میں مسافروں کے سامان کو ایئرپورٹ کے اندر اور اندر سے باہر لانے کی نوکری سرانجام دے رہے تھے۔ ایئرپورٹ اندر سے صاف ستھرا تھا جسکا مطلب ہے بہت سے لوگ اس کی صفائی پر معمور تھے۔ سارے معاملات سے فارغ ہوکر میں اندر لاؤنج میں آکر کافی لے کر بیٹھ گیا۔ فلائٹ سے کچھ دیر قبل واش روم کا چکر لگایا، ہاتھ دھوتے وقت دیکھا کہ واش روم کی صفائی کرنے والا فون پر کسی سے کہہ رہا تھا

"ابھی تو پیسے ختم ہیں میرے پاس، بس دو دن رہ گئے ہیں پھر تنخواہ آجائے گی تو چاول رہنے دو بس تھوڑا سا آٹا لے لو"۔

میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ انسان واش روم صاف کرنے کی نوکری کرتا ہے جس کا مطلب ہے کہ شرم کیے بغیر محنت سے اپنا گھر چلا رہا تو اس کی کچھ مدد کرنی چاہیے، میں نے اندازہ لگا کر دو تین دن کے حساب سے ایک خاندان کے خرچ کے برابر پیسے دیے جو اس نے شکرانے کی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لیے۔

اتنی سی بات ہوئی اور راز کھل گیا، میں حیران تھا کہ اتنی آسان بات مجھے پہلے کیوں نہیں سمجھ آئی۔ بس سارا سفر، سارا رستہ، شہر، جہاز اور ملک بدلتے رہے مگر میرے دل و دماغ میں ایک ہی گونج تھی۔

سیرو فی الارض، ہماری زمین میں گھومو پھرو

واہ، کیا بات کہہ دی۔ ایئرپورٹ کے داخلے پر کھڑے سپاہی، پارکنگ بوتھ پر کام کرتے لڑکے، پارکنگ کی صفائی اور سیکیورٹی پر معمور جوان، لوگوں کو سامان پہنچاتے محنتی افراد اور ایئرپورٹ کی صفائی کرتے مرد و خواتین، ان سب لوگوں کا رزق مسافروں سے وابستہ ہے، مسافر ہیں تو ان کی نوکریاں ہیں، لوگ آتے جاتے ان کو ٹپ بھی دیتے ہیں۔ اسی سے ان کے گھر چلتے ہیں، ان کے بچے کھاتے ہیں، تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کے بزرگوں کو دوائیں ملتی ہیں، وہ موسم کی شدت سے بچتے ہیں، ان کے گھروں کی خوشیاں اسی رزق سے منسلک ہیں۔ کمال کردیا، کوزے میں سمندر بند کر دیا۔
میں نے اللہ جی سے کہا آپ بھی کمال کرتے ہیں، رب آپ خود ہیں اور ہمیں ربوبیت میں حصہ دار بنا لیتے ہیں تاکہ ہمارا بے حساب فائدہ ہو جائے، پالنا آپ کا کام ہے لیکن آپ ہمیں اپنے ساتھ ملا کر ہمارا

دل دماغ روشن اور مال پاک کرتے رہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوا انھوں نے مجھ سے کہا ہو

سیرو فی الارض، ہماری زمین میں گھومو پھرو

میں نے جسارت کی کہ اجازت ہو تو اس کو ایسے لکھ دوں۔
سیرو فی الارض ہماری زمین میں گھومو تاکہ لوگوں کے گھر کھانا پک سکے کوئی بھوکا نہ سوئے۔
سیرو فی الارض ہماری زمین میں گھومو تاکہ لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کر سکیں۔
سیرو فی الارض ہماری زمین میں گھومو تاکہ لوگوں کے بزرگوں کو گھر کا سکون اور ادویات میسر ہوں۔
سیرو فی الارض ہماری زمین میں گھومو تاکہ لوگ گرمی سردی کی شدت سے محفوظ رہیں۔
سیرو فی الارض ہماری زمین میں گھومو تاکہ کسی سفید پوش کی بیٹی کی شادی ہو سکے۔
بلکہ اللہ جی گستاخی نہ ہو تو یہی کہہ دیتا ہوں۔

سیرو فی الارض۔ ہماری زمین میں گھومو تاکہ پوری دنیا کی معیشت چلتی رہے

میری ایک کتاب میں لکھا ہے کہ خدا کی کتاب کتابوں کی خدا ہوتی ہے مجھے ایک بار پھر صدق دل سے یقین آ گیا کہ ایسا ہی ہے۔ صرف تین لفظ کہے سیرو فی الارض اور پوری دنیا کی اکانومی چلا کہ رکھ دی۔ دنیا کے کسی شاعر یا ادیب سے کہیں کہ تین لفظ لکھیں اور اس سے پوری دنیا کا کوئی بھی مسئلہ حل کردیں۔ اللہ جی آپ کی کتاب نے چیلنج کیا تھا کہ کوئی اس جیسی دس آیات یا ایک سورت لکھ کر لا دے۔ آپ کی اجازت سے میں چیلنج کرتا ہوں تین لفظ ہی اس جیسے لکھ کر لا دے۔

بس پھر کیا تھا، شہر اور ملک بدلتے رہے اور سیرو فی الارض ایک بہترین ہمسفر کی طرح میرے ساتھ رہی۔ جس ہوٹل میں ٹھہرا وہاں تقریباً 55 سالہ خاتون صبح نہایت لذیذ اور صحت افزا ناشتہ بنا کر میرے کمرے میں لاتی تھی۔ میں اس کی زبان نہیں بول سکتا تھا اور اسے انگریزی نہیں آتی تھی، مسکراہٹ سے شکریہ ادا کرتا اور وہ بھی بدلے میں ہلکا سا مسکرا دیتی تھی۔ اس کا چہرہ اس کے تلخ

تجربات و حالات کی عکاسی کرتا تھا جب ہی وہ اس عمر میں بھی یہ کام کر رہی تھی اور سیرو فی الارض اس کے گھر کی معیشت کو بحال رکھے ہوئے تھی۔

عربی زبان کے اصول کے مطابق جب سیرو لکھا جائے تو اس کا مطلب حکم ہوتا ہے اور حکم کوئی گزارش نہیں ہوتا بس حکم ہوتا ہے جسے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے

مردانگی

ہزاروں سال پہلے انسان قبیلوں کی شکل میں رہتے تھے جس میں جوان مردوں کا کام ہوتا تھا روزانہ شکار کر کے لانا تاکہ پورا قبیلہ کھا کر سوئے اور کوئی بھوکا نہ رہے۔ شکار کرنے کے لیے طاقت، جرآت اور مہارت کی ضرورت ہوتی تھی اس لیے یہ کام انھیں مردوں سے لیا جاتا تھا جو طاقت و مہارت میں سب سے بہتر ہوتے تھے۔ باقی کھیتی باڑی کے لیے سبزیوں پھلوں کی پہچان اور بچوں کی پرورش کے لیے مامتا کی گرمائش چاہیے ہوتی تھی اس لئے یہ دونوں کام قبیلے کی عورتوں کی ذمہ داری ہوا کرتے تھے۔ الغرض ہزاروں سال قبل بھی انسان یہ سیکھ چکا تھا جو جس کام میں ماہر ہوگا وہی کام اس کے سپرد کیا جائے گا ہزاروں سال اس روش کے مطابق گزارنے سے مردوں کو عورتوں پر سبقت حاصل ہونا شروع ہوگئی کیونکہ جو کھلاتا ہے اس کی ماننی بھی پڑتی ہے چاہے پرانے زمانے کے مرد ہوں یا آج کی IMF

مزید یہ ہوا کہ مختلف قبائل وسائل کی خاطر دوسرے ہمسایہ قبائل پر حملہ آور ہوتے تھے اور ان کا مال اسباب لوٹ لیا کرتے تھے، ایسے حملوں کی روک تھام کے لیے بھی مردانہ افرادی قوت و مہارت کام آتی

تو یوں دنیا کی پہلی فوج قائم ہوئی جو ریاست یعنی قبیلے کا دفاع کرتی تھی اور آپ جانتے ہی ہیں جو دفاع کا نعرہ لگاتا ہے وہی مالک بن کے بیٹھ جاتا ہے اور یہ سب بھی مرد تھے۔

ان سب مسائل اور حالات کے پیش نظر قبائل اپنی نسلوں کی پرورش بھی اسی انداز سے کرتے رہے جس میں لڑکوں کو بہادری، جنگ، شکار، دفاع اور حکمرانی جیسے شعبے ملے اور لڑکیوں کو نازک کاموں میں مصروف کیا گیا۔ جب شکاری لڑکا فخر سے آکر کہتا تھا کہ میں تیسری بار جنگلی بیل کا شکار کیا ہے وہاں اسی کی بہن یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں پچھلے تین سال سے کھانا بنا رہی ہوں اور کھیتوں کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ پس کچھ کاموں کو کارنامے قرار دے دیا گیا اور کچھ کام، کام بھی نہیں گنے گئے بلکہ عورتوں کی روزمرہ کی ذمہ داری کہلائے۔

ان کارناموں کی لمبی فہرست نے مردوں کو قبیلے کے اہم فیصلے کرنے کا، قوانین طے کرنے کا، ان میں ردوبدل کرنے کا اور توڑنے کا اختیار بھی دے دیا یعنی مرد حکمران، مرد قاضی، مرد ہی سپہ سالار اور مرد ہی حکیم بنے یوں مردوں کو دوسرے علاقوں کے سفر کرنے کا، مختلف تہذیبوں کا مطالعہ کرنے کا اور تاریخ لکھنے کا اعزاز بھی ملا۔ ہماری اس دنیا میں آج جتنا بھی مذہب، فلسفہ، تاریخ یا حکمت کا مواد موجود ہے وہ مردوں کا بتایا ہوا اور لکھا ہوا ہے۔ انبیاء، اولیا، مورخین، محدثین، حکماء،

حکمران اور سائنسدان، ان سب شعبہ ہائے زندگی پر مردوں نے دس ہزار سال تک حکمرانی کی۔

آپ تاریخ میں قوانین کا جائزہ لیں تو آپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کو لکھنے والے صرف مرد ہی ہو سکتے ہیں، مثال کے طور پر چند ایک ذیل میں درج ہیں

1.

قدیم یونان میں ہر جوان لڑکی کو شادی سے پہلے چند راتیں بادشاہ یا شہزادے کے ساتھ گزارنی پڑتی تھیں پھر اس کی اصل رخصتی کی جاتی تھی۔ آپ کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوگا لڑکی اور اس کے گھر والے اس ظلم کے آگے بے بس ہوں گے اور وہ اصلی دولہا بھی کتنا دکھی ہوگا جسکی ہونے والی بیوی کو پہلی چند راتیں کسی اور کے ساتھ بتانی پڑیں تو یقین جانیے ہر گز ایسا نہیں ہے۔ یونان کے شاہی خاندان کے مردوں کو کنواری دوشیزاؤں کی حاجت رہتی تھی وہ چاہتے تو طاقت کے زور سے بھی ایسا کر سکتے تھے مگر روتی ہوئی ڈری ہوئی لڑکیوں کی نسبت مردوں کو ہنستی ہوئی اور اپنا آپ نچھاور کرتی ہوئی لڑکیاں بھاتی ہیں۔ اس لیے اس دور کے مذہبی پیشواؤں نے فتویٰ دے دیا کہ بادشاہ کا گھر دراصل خدا کا گھرانہ ہے اور اس کے افراد خدا کے اہل خانہ ہیں پس جو بھی لڑکی خدا کے گھر میں چند راتیں گزارے گی تو اس کی اولاد اور رزق

میں برکت ہوگی۔ چند دہائیوں کے بعد یہ حال ہو گیا کہ والدین سفارشیں کرواتے تھے کہ ان کی بیٹی کو جلد بادشاہ اپنی صحبت میں رکھے تاکہ اس کی جلد شادی ہو اور دونوں خاندان خدا کی برکتیں سمیٹ سکیں۔

2.

قدیم ہندوستان میں پروہتوں نے بھگوان کا نام استعمال کر کے بیوہ عورت کو منحوس قرار دے دیا، اس کا لوگوں سے ملنا اور خوشی کی رسومات میں شرکت کرنا تک ناممکن بنا دیا گیا، وہ صرف سفید لباس پہن سکتی تھی جو ہندوازم میں افسوس کا رنگ مانا جاتا ہے اور اسے گنجا کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ آتے جاتے دور سے پہچانی جائے اور اس سے اجتناب کرنے میں آسانی ہو۔ اس کی دوبارہ شادی بھگوان کے شراپ کو دعوت دینا تھا اس لیے کوئی ایسی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا پس اس عورت کی زندگی ایک شرمناک جہنم بن جاتی تھی جس میں اس کا قصور فقط اتنا ہوتا تھا کہ اس کا خاوند مر گیا۔

3.

قوم موسیٰ نے جناب موسیٰ کے جانے کے بعد کاہنوں کے ساتھ مل کر رسم بنا دی کہ اگر کوئی شخص مر جائے یا مارا جائے تو اس کی بیوہ اس کے دوسرے بھائی کی ملکیت ہوگی، وہ چاہے تو اسے بیوی، باندی یا غلام

بنا کر ساری زندگی گھر کے کاموں میں لگا سکتا ہے۔ اس ضمن میں کاہنوں کے پاس تورات کی تفاسیر میں روایات موجود ہوتی تھیں جو جناب موسیٰ کے حواریوں یعنی صحابہ کے نام کے ساتھ منسوب کی جاتی تھیں اور تقلید پسند عوام کے پاس ماننے کے علاوہ چارہ نہ رہتا تھا۔

4.

حضرت عیسیٰ کے دنیا سے جانے کے سینکڑوں سال بعد جب اناجیل مرتب ہوئیں تو شریعت میں لکھا گیا کہ چرچ میں خداوند کی خدمت پر معمور لڑکیاں شادی نہیں کر سکتیں کیونکہ انھوں نے اپنا آپ خداوند کے سپرد کر دیا ہے اور چرچ میں موجود مذہبی پیشواؤں کو نوجوان کنواری لڑکیوں کی دستیابی میں کوئی مشکل نہ رہی۔ تاریخ ان اندوہناک واقعات سے بھری پڑی ہے جب کسی NUN کو حمل ٹھہر جاتا تو اس کا قتل کر دیا جاتا، یا پھر اسے چرچ سے نکال کر اسکے پورے خاندان کو علاقے سے بے دخل کر دیا جاتا یا کبھی کبھار اس کے بچے کو پیدا کر کے اسکے گھر بھیج دیا جاتا اور اس لڑکی کو چرچ کے کاموں کے لیے زندگی بھر خدمت میں مصروف رکھا جاتا۔ یہاں بھی حیرانی کی بات یہ ہے کہ والدین حسرت اور سفارش کا استعمال کرتے تھے کہ ان کی لڑکی کو چرچ میں بحیثیت NUN شامل کر لیا جائے کیونکہ ان کو پڑھایا گیا تھا کہ ایسا ہونا خداوند کی طرف سے قبولیت ہے۔

5.

مسلمانوں میں بھی حلالہ کے معاملے کو دیکھ کر دنیا حیران ہے کہ میاں بیوی میں ناچاقی کے باعث طلاق واقع ہو جائے تو بیوی کو واپس لینے سے قبل اسے کسی اور مرد کے ساتھ چند راتیں گزارنا ہوں گی اور اس میں لازماً شرطیہ طور پر لکھا گیا ہے کہ ان راتوں میں ہمبستری فرض ہے ورنہ حلالہ نہیں پورا ہوگا۔ اب سوچیں اس کو شریعت رسول مانتے ہوئے مرد اپنی بیوی کو دوسرے مرد کے ساتھ بھی سلا دیتے ہیں اور ان کی عقل و غیرت کو ذرہ سا بھی فرق نہیں پڑتا۔ کسی مصری عورت نے کہا تھا کہ طلاق عورت کی غلطی سے یا بے راہ روی سے ہوئی ہو تو مرد کا بھی حلالہ ہونا چاہیے مگر مردوں کے بنائے گئے قوانین جن کا اطلاق بھی مرد کرتے ہوں وہاں عورت کی سنوائی نا ممکن ہے۔

افریقی ادب میں لکھا ہے کہ جب تک شیر لکھنا نہیں سیکھ لیتا تب تک ہر کہانی میں انسان ہی شیر کا شکار کرتا رہے گا۔ عورت کو اپنے حق کے لیے خود کھڑا ہونا ہوگا، کوئی مرد اپنے اختیارات اور رنگ رلیوں کو خطرے میں ڈال کر عورت کے لیے آواز نہیں اٹھائے گا۔ شیرنی کو لکھنا، پڑھنا اور فیصلہ کرنا سیکھنا ہوگا تاکہ وہ مرد شکاری کے جال اور

چال کے بارے میں باقی دنیا کو آگاہ کر سکے ورنہ ہر دفعہ شیرنی ہی شکار ہوگی اور شکاری فاتح۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

پانی کا گلدستہ

نیپالی زبان میں جہاں پانی اکٹھا ہو جائے اس جگہ کو پوکھری کہتے ہیں اور نیپال میں ایک ایسا شہر ہے جہاں بہت سی جگہوں پر بارشوں، چشموں اور آبشاروں کا پانی اکٹھا ہو کر خوبصورت جھیلیں بناتا ہے اسی مناسبت سے اس شہر کو پوکھرہ کہتے ہیں۔ پوکھرہ جھیلوں کا شہر یعنی بلاشبہ پانیوں کا ایک گلدستہ ہے۔

اگر آپ انسانی نفسیات پر تفکر کرنے کے شوقین ہیں اور آپ کو شہر، کافی، حسین و دلکش مناظر، پرسکون فضا، تقریبا روزانہ بارش، بادل، پرامن لوگ، دن رات جاگتے بازار، بازاروں میں اپنے محلے کی طرح ٹہلتے یورپی سیاح، ساکت کھڑے مذہبی شخصیات کے بت اور مینار، پہاڑ، آبشاریں، چشمے اور جھیلیں ایک ساتھ دیکھنے ہوں تو شائد پوکھرہ ہی دنیا میں واحد شہر ہوگا جو ان سب خصوصیات کا ایک ساتھ حامل ہوگا۔ پوکھرہ شہر نہیں ایک مسحور کرتی نفسیاتی کیفیت ہے۔

جو انسان کو بادل بنا کر ہوا میں لے اڑتی ہے اور پوکھرہ کی فضاء میں تحلیل کر کے نشے کی سی حالت میں مبتلا کر دیتی ہے، یہ نشہ وہاں

سے آکر بھی بہت عرصہ اپنے مسافر کو ایسے ہی اپنی طرف کھینچتا ہے جیسے پھول بلبل کو۔ پوکھرہ کی کیفیت عام لفظوں کے بیان سے بالا ہے اور خاص لفظوں کے تخیل سے بلند۔

لوگ کہتے ہیں پوکھرہ شہر کے جنوب میں فیوا جھیل واقع ہے، اس جھیل کی خوبصورتی، وسعت، مقاصد، فوائد اور پہنچ کو دیکھتے ہوئے یہ جملہ مناسب معلوم نہیں ہوتا بلکہ مبالغہ نہ ہو تو یہ جملہ فیوا جھیل کی گستاخی معلوم ہوتا ہے، جملہ یوں ہونا چاہیے کہ فیوا جھیل نے اپنی مختلف قسم کی کشش کے باعث جن لوگوں کو اپنی ارد گرد آباد ہونے پر مجبور کر دیا اس علاقے کو پوکھرہ کہتے ہیں۔

بڑے کہتے ہیں عمر میں بڑوں کا ادب کرنا چاہیے تو جان لیجئے کہ فیوا جھیل کی عمر 13000 سال ہے یہ جھیلوں کی بزرگ ہے، فیوا میں کہیں کوئی شور نہیں سننے کو ملے گا، اس میں خاموشی ہے، گہرا سکوت ہے ایک ٹھہراؤ ہے جو سکھاتا ہے کہ آپ کتنے ہی بڑے، بزرگ یا اہم کیوں نہ ہو جائیں، آپ کو کتنے ہی ہنگاموں کو اپنے اندر سمیٹنا ہی نہ پڑ جائے پھر بھی آپ میں ٹھہراؤ ہونا چاہیئے، پہاڑوں سے گرتا ٹکراتا ہوا پانی شور کرتا ہوا پانی جیسے ہی فیوا کے دامن میں پہنچتا ہے تو بلکل ایسے خاموش ہو جاتا ہے جیسے بلکتا ہوا بچہ اپنی ماں کے دامن میں آتے ہی پرسکون ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں جو فائدہ دے اس کے شکر گزار بنو، فیوا اپنی ایک جانب
پورے شہر کو سیاحوں سے سے آنے والی آمدن سے مستفید کرتی ہے
کیونکہ یہ نیپال میں سب سے زیادہ دیکھی جانے والی جھیل ہے۔ دوسری
طرف اس کے پانی کے بہاؤ کو استعمال کرتے ہوئے بجلی پیدا کی جاتی
ہے، فیوا کی تیسری طرف مچھلیوں کی بھرمار تازہ اور سفید گوشت مہیا
کر رہی ہے، فیوا کے تین اطراف میں ایک ہزار سے زائد دکانوں میں
کم از کم دس ہزار افراد کا رزق وابستہ ہے۔ فیوا کے سب سے آخری
جانب رتنا مندر ہے جو نیپال کے شاہ مہندرا نے اپنی بیوی رتنا کے لیے
بنوایا تھا اور یہیں پر شاہی خاندان کی رہائش رہی، یہ نام سے مندر ہے
اور اصل میں شاہی محل ہے جو کم و بیش 56 ہزار مربع میٹر پر
مشتمل ہے۔ اور فیوا کی عین وسط میں براہی مندر ہے۔
ہندو دھرم میں ایک مشہور اصطلاح ہے متریکا، متریکا سات دیویوں کو
اکٹھے پکارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس کے لئے ایک اور
اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے سپتا متریکا یعنی سات مائیں، ان سات
میں سے ایک دیوی ہیں وراہی جن کو نیپال میں براہی اور ہندوستان
کے صوبہ راجھستان میں داندنی بھی کہا جاتا ہے، انھی وراہی دیوی کا
ایک مندر فیوا جھیل کے بالکل وسط میں ہے اور صرف کشتی کے
ذریعے یہاں تک رسائی ہوتی ہے۔ دور دراز سے ہندو دھرم کے ماننے

والے اور سیاح یہاں درشن کے لیے آتے ہیں، ان کا ماننا ہے کہ یہ دیوی اپنے بھگتوں کی نفسیات کو منفی خیالات اور بری نظر سے بچاتی ہے اور مثبت طاقت مہیا کرتی ہے۔

نیپال میں شراب اور اسکا کاروبار جائز ہے آپ کو کھانے پینے کی دکانوں سے زیادہ شراب کی دکانیں ملیں گی، بارڈر کے دوسری طرف انڈیا کا صوبہ بہار ہے جہاں شراب منع ہے تو بہت سے انڈین زیادہ تر چھٹی کے دن یہاں شراب پینے آتے ہیں، انڈینز کو نیپال کے لیے ویزہ یا پاسپورٹ کی بھی ضرورت نہیں ہے، بس پر یا اپنی گاڑی پر سوار ہوں اور آجائیں۔ شراب کی ڈھیروں دکانوں، سستی اور مہنگی شراب کی فراوانی اور ہر طرح کی پینے کی آزادی کے باوجود آپ کو کوئی بندہ نشے میں یا نشے والی حرکات کرتے یا بدتمیزی کرتے نہیں نظر آئے گا نہ دن کے وقت نہ رات کے کسی پہر اور نہ ہی ہفتے کی آخری راتوں میں نہ چھٹی کے دن۔

کافی کی دکانیں پوکھرہ میں اتنی ہیں جتنی آپ گن سکتے ہوں، پوکھرہ کے لوگ خود زیادہ کافی نہیں پیتے مگر وہ جانتے ہیں کہ ان کے ہاں آنے والے مہمان سیاح کافی پیتے ہیں اس لیے انھوں نے شہر کا کونہ کونہ کافی سے بھر دیا ہے۔ مہمان نوازی کا جو اصول ہمارے ملک میں اور رواج میں شامل ہے مجھے اس سے قدرے اختلاف ہے، ہم اپنی

مرضی کا کھانا پینا اپنی مرضی کی مقدار سے مہمان کو زبردستی کھلا کر سمجھتے ہیں کہ مہمان نوازی ہو رہی ہے، اس کا آسان جواب پوکھرہ کی کافی کی دکانیں ہیں، مہمان کو وہ کھانے پینے کو دیں جو اس کا دل چاہتا ہے نہ کہ ہمارا اور اتنا ہی جتنا مہمان چاہتا ہے۔

پوکھرہ میں جہاں بھی جائیں آپ کو ہر طرف مذہب ہی مذہب کا رنگ نظر آئے گا، کہیں شانتی کا مندر کہیں شیوا کا اوتار، کہیں بدیابسینی کا جلوہ کہیں بھدراکالی، بھیم سن یا کیداریشور کے آستانے اور جگہ جگہ مہاتما بدھ کی گیان دیتی مورتیاں، بدھا کی نیم وا آنکھوں والی مورتیاں جو یہ بتاتی ہیں کہ آنکھیں کم کھولو تاکہ باہر صرف اتنا ہی نظر آسکے جتنا زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے اور اندر کی آنکھیں مکمل کھول کر رکھو تاکہ اتنا نظر آئے جتنا دوسروں کے لیے بھی مشعل راہ بن جائے، اس سب کے باوجود آپ ایک بات پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پورے شہر اور ملک کے کسی کونے میں کوئی بھی آپ کو اپنے مذہب کا پرچار کرتا نظر نہیں آئے گا، یہاں 81 فیصد ہندو، 8 فیصد بدھ مت، 5 فیصد مسلم اور 3 فیصد کیراتزم ہے مگر نہ کوئی جماعت اپنے دھرم کی تبلیغ کرتی ملے گی اور نہ آپ کو کوئی کاغذ کا پرچہ تھمایا جائے گا جو آپ کو ان مذاہب کی دعوت پیش کر رہا ہو۔ مذہب ایک خاموش صوفی بزرگ کی طرح خانقاہ میں منتظر ہے جو لوگوں کی تلاش

میں کبھی بھی خود نہیں نکلتا ہاں لوگ کبھی کبھی اسے تلاش کرتے وہاں ضرور پہنچ جاتے ہیں۔

محبت اور مودت دونوں عربی زبان میں نفسیاتی جذبات کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ ہیں، محبت کا مطلب ہی کسی چیز کا آپ کے لیے اتنا اہم ہونا ہے کہ اس کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہو جانا اور مودت عربی زبان میں اس نفسیاتی حالت کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی اہمیت اتنی شدت اختیار کر جائے کہ اس چیز کے بغیر رہنا ناممکن ہو جائے، ہزاروں سال پرانے عربی ادب میں لکھا گیا ہے کہ مینڈک کو پانی سے محبت ہوتی ہے وہ پانی پا کر خوش ہوتا ہے اور پانی کے بغیر اداس رہتا ہے مگر مر نہیں جاتا اور مچھلی کو پانی سے مودت ہوتی ہے اسے پانی نہیں ملتا تو وہ مر جاتی ہے۔

جھیل اور پانی میں بھی مودت ہوتی ہے، دونوں ایک دوجے کے بغیر ختم ہو جاتے ہیں زندہ ہی نہیں رہ سکتے، اسی مودت کے سبب کی وجہ سے جو شے بھی پانی کے ساتھ بہتی ہوئی جھیل میں آ جائے، جھیل اسے بھی مودت کے بدولت سر آنکھوں پر بٹھا لیتی ہے۔

اس جھیلوں والے شہر کے لوگوں میں بھی آپ کو مودت کا عکس نظر آئے گا، وہ آپ کو جھک کر ملیں گے یعنی ملاقات کا آغاز ہی عاجزی سے کرتے ہیں، وہ جھیل کے ظرف کی مانند پانی میں آنے والی ہر شے

کو قبول کرنے کے انداز میں آپ سے آپ کا مذہب، ملک، قوم اور آنے کی وجہ تک بھی دریافت نہیں کرتے، وہ آپ کو کوئی بھی سواری کرائے پر دیتے وقت بھی آپ سے ضمانت طلب نہیں کرتے، انھیں یقین ہے آپ ان کی امانت کو حفاظت سے رکھیں گے اور لوٹا بھی دیں گے، سائیکالوجی کے مطابق کسی کو چور سمجھنے کے لیے خود کا چور ہونا سب سے بڑی وجہ ہے جیسا کہ بقول میاں محمد بخش صاحب

آپے بھلا جے کوئی ہووے، سب نوں بھلا تکیندا

(جو خود اچھا ہوتا ہے اسے سب اچھے ہی نظر آتے ہیں)

میاں صاحب نے انسانی نفسیات کو جس تفصیل، خوبصورتی اور آسانی سے بیان کیا ہے شاید اس کی مثال ڈھونڈنا ممکن نہ ہو، آگے منفی نفسیات کے بارے میں فرماتے ہیں

شیش محل وچ کتا وڑیا تے اس نوں سمجھ نہ آوے
جیہڑے پاسے جاوے اونہوں کتا ہی نظریں آوے

(جو اندر سے کتا ہوتا ہے وہ اگر شیشوں والے کمرے میں چلا جائے تو اس کو ہر دیوار میں کتا یعنی اپنا آپ ہی نظر آتا ہے، ہم جیسے خود ہوتے ہیں دوسروں کو بھی ویسا ہی دیکھتے ہیں۔)

Poison vs Venom

سانپ کا زہر شکار کو چبانے اور ہضم کرنے کے مرحلے میں استعمال ہونے والے اعضاء کے مسلسل استعمال سے بنتا ہے۔ یہ زہر سانپ کے لیے زندگی کا کام کرتا ہے، ایک طرف یہ اسے بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے، اسے قوت مدافعت مہیا کرتا ہے اور دوسری جانب وہ اسے اپنی جان بچانے کے لیے استعمال کرتا ہے اور تیسرا استعمال شکار کے دوران ہے جنھیں کھا کر سانپ اپنے زندہ رہنے کا سامان مہیا کرتا ہے۔ کوبرا سانپ پر تحقیق کرنے والے امریکی ماہرین کا کہنا ہے کہ تینوں طرح کے استعمال کے دوران سانپ کے جذبات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی یعنی سانپ شکار کرتے وقت یا اپنا بچاؤ کرتے وقت بھی زہر کا استعمال نفرت سے نہیں کرتا مگر اس کا زہر اس کے شکار یا مخالف کی جان لے لیتا ہے کیونکہ یہ سانپ کے زہر کا اثر ہے نہ کہ اس کی نفرت کا۔

ہم میں سے بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ سانپ کے زہر کو انگریزی زبان میں Poison نہیں کہا جاتا۔ اسے Venom کہا جاتا ہے ۔ جی ہاں Poison اور Venom دو الگ اصطلاحات، الگ الفاظ اور ان کا استعمال بھی الگ ہے۔

جب ہم کسی زہر آلودہ شے کو کھا لیں یا اسے اپنے جسم میں داخل کریں تو اسے Poison کہا جاتا ہے اور جب کوئی زہریلا جاندار اپنی جان بچانے کے لیے یا شکار کرنے کے لیے زہر کا استعمال کرے تو اسے Venom کہا جاتا ہے۔

پس جب لوگ کوئی زہریلی شے کھا کر مرتے ہیں تو وہ Poison سے مرتے ہیں اور جب سانپ یا بچھو ڈنگ مارتا ہے تو وہ Venom داخل کرتا ہے۔ اسی وجہ سے معدے کی ایک بیماری کا نام Food Poisoning رکھا گیا ہے کیونکہ وہ کھانا ہم نے خود اپنے جسم میں داخل کیا ہوتا ہے۔

سانپ دنیا کے ان گنتی کے چند جانوروں میں سے ہے جو اپنی جان بچانے اور شکار کرنے کے لیے زہر کا استعمال کرتا ہے۔ چیتا شکار کرنے کے لیے اپنی رفتار کا استعمال کرتا ہے اور اپنی جان بچانے کے لیے بھی رفتار کا ہی، مگر جب چیتا جان بچا رہا ہوتا ہے تو کسی کی جان نہیں جاتی جبکہ سانپ اپنی جان بچانے کے لیے بھی مخالف کی جان لے بیٹھتا ہے۔ جانوروں میں سے بدترین سطح پر شمار ہونے کی وجہ بھی یہی ہے اسے انسانوں کے علاوہ بہت سے جانور بھی پسند نہیں کرتے اور یہی وجہ ہے کہ سانپ کسی دوسرے جاندار کے ساتھ مل کر نہیں رہ پاتے کیونکہ دوسرا ان کی فطرت کا شکار ہوکر مر ہی جاتا ہے یا تکلیف اٹھاتا رہتا ہے۔

یہی Poison اور Venom کا رشتہ انسانی تہذیب کا بھی ازل سے ہم قبیلہ رہا ہے۔ انسان کے بچوں کو جو زہر بچپن سے نوجوانی تک آنکھوں اور کانوں کے راستے ان کے دل و دماغ تک پہنچایا جاتا ہے وہ بعد میں Venom کی شکل میں اس کے اندر سے اسکی زبان اور عمل کے راستے باہر نکلتا ہے۔ وہ بچہ بڑے ہو کر اسے Venom سمجھتا ہی نہیں ہے کیونکہ اس کو لگتا وہ اپنے بچاؤ کے لیے عقل کا استعمال کر رہا ہے۔ وہ اپنی زبان سے اور عمل سے دوسروں کو ساری زندگی تکلیف دیتا ہے اور مارتا رہتا ہے۔ اسے اس بات کا احساس تک بھی نہیں ہو پاتا کیونکہ اس کے نزدیک یہ Venom نہیں بلکہ اپنے بچاؤ کا طریقہ ہے، ایک ہنر ہے اور سمجھداری ہے۔ وہ زندگی میں اس کے برعکس اچھی باتیں کانوں سے سنتا ہے اور آنکھوں سے ایسا عمل ہوتے بھی دیکھتا ہے مگر اپنے دل کو اس طرف مائل نہیں کرتا اور یہی حرکت اسے Venom کے استعمال پر پختہ تر کر دیتی ہے۔

اپنے بچاؤ کے لیے دوسروں کو تکلیف دینے والے جانور جانوروں سے بھی بدتر شمار کیے جاتے ہیں حالانکہ جانور ایسا کرتے وقت کسی منفی جذبے کا شکار بھی نہیں ہوتے مگر حضرت انسان اپنے Venom کا استعمال باقاعدہ نفرت، بغض، مقابلہ اور بدلہ کی خاطر کرتا ہے ایسے افراد کو قرآن نے ایک ہی آیت میں نہایت واضح طور پر بیان کر دیا ہے

لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَاؕ اُولٰٓـئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ‌ ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ

اُن کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کے لیے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اور اُن کے لیے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں، یہ لوگ جانوروں جیسے ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ بدتر ہیں، یہی لوگ غافل ہیں۔

الاعراف 179

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

عظیم بدھا اور تین جانور

بدھ مت میں انسانی نفس کی تربیت، اصلاح اور ترویج اولین ترجیح ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے تمام ممکنہ ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بدھا نے جب انسانوں کو تبلیغ کی تو انسانوں کی مختلف اقسام کو دیکھتے ہوئے ترویج نفس کے لیے مختلف طرائق کا استعمال کیا اور انھی بنیادوں پر بعد میں بدھ مت کے مختلف فرقے بھی وجود میں آئے۔
جن قوانین پر بدھ مت کے تمام فرقے آج بھی متفق ہیں وہ انسانی نفس کی اصلاح اور اسے مکتی یعنی دائمی سکون کی منزل تک پہنچانا ہے۔
اس ضمن میں تین جانوروں کی اصطلاح پیش کی جاتی ہے۔
بدھا کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام انسان تین سواریوں پر سوار ہیں اور تینوں سواریوں کے آگے تین مختلف جانور ہیں جو ان کو منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔
پہلی سواری کے آگے بھیڑ ہے، بھیڑ پر تحقیق بتاتی ہے کہ بھیڑ اپنے بچاؤ کے لیے بھاگتے وقت پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی، اسے بس اپنی نجات کی فکر ہوتی ہے وہ یہ نہیں سوچتی اور نہ سوچنا چاہتی ہے کہ باقی بھیڑوں کا کیا بنا، وہ بس بھاگتی ہے۔ بھیڑ کی رفتار کچھ زیادہ نہیں ہوتی جس کی وجہ سے اس کیلئے پیچھے مڑ کر دیکھنا نسبتاً آسان ہے مگر اس

کے باوجود وہ نہیں جاننا چاہتی کہ باقی بھیڑیں کس حال میں ہیں۔ وہ فقط اپنی مکتی، اپنے سکون اور اپنی نجات پر مرکوز رہتی ہے۔ کسی دوسری بھیڑ کے سکون کی پروا کیے بغیر۔ اس سواری پر سوار لوگ بھیڑوں کی طرح ہوتے ہیں، بھیڑوں کی طرح سوچتے ہیں اور ذاتی مفادات کے لیے سرپٹ بھاگتے ہیں۔

دوسری سواری کو ہرن کھینچتی ہے اور ہرنوں کے مطالعہ سے بدھوں نے سیکھا کہ ہرن جب اپنی نجات یعنی جان بچانے کے لیے بھاگتی ہے تو اسکی رفتار بھیڑ سے تین گنا زیادہ ہوتی ہے اس کے باوجود ہرن مڑ مڑ کر باقی ہرنوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے کیونکہ اسے اپنے ساتھ ساتھ دوسری ہرنوں کی نجات اور سکون کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ یہ انسانوں کی دوسری قسم ہے جو اپنے لیے سکون یا مکتی کا سوچتے وقت اپنے ساتھیوں کو ہمراہ رکھنے کے قائل ہوتے ہیں۔

آخری سواری کا سپہ سالار بیل ہوتا ہے، بیلوں پر غور کرنے سے علم حاصل ہوتا ہے کہ بیل پر جتنا بھی وزن ڈال دیا جائے وہ چلنے سے انکار نہیں کرتا اور نہ اسے پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ وہ کتنے بیلوں کا وزن اٹھائے ہوئے ہے، اس کا واحد مقصد دوسروں کی نجات ہے، دوسروں کی مکتی کو وہ اپنی مکتی سمجھتا ہے اس لیے وہ بس چاہتا ہے کہ باقی سب کو سکون کی منزل مل جائے۔ بیل دوسروں کی آسانی کے لیے قربان

ہونا پسند کرتا ہے، شکوہ کی بجائے شکر ادا کرتے ہوئے۔
میں نے مدتوں ان تعلیمات پر غور و فکر کرنے اور پرکھنے سے ان میں کچھ اضافہ کرنے کی جسارت کی ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے بیک وقت ایک انسان بھی ان تینوں مراحل سے گزر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بھیڑوں میں پیدا ہوا ہو جوانی میں ہرنوں کے بیچ بھاگتا ہو اور پھر آہستہ آہستہ بیل کی ذمہ داری اٹھا لے۔ ایک اور ممکن صورت یہ بھی نظر آتی ہے کہ ایک انسان ایک ہی وقت میں کچھ لوگوں کے لیے بھیڑ، کچھ دوسرے افراد کے لیے ہرن اور کسی تیسرے گروہ کے لیے بیل کا کردار نبھا رہا ہو۔ ایک تیسری صورت یوں بھی ہوگی کہ کوئی انسان کسی ایک معاملہ میں، کسی ایک منظر میں، کوئی ایک فیصلہ کرتے وقت بھی ان تینوں مراحل کو مد نظر رکھتا ہو اور اس میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتا ہو کہ اسے یہاں ہرن، بھیڑ یا بیل میں سے کون سا کردار نبھانا ہے۔
اپنا تجزیہ کرنے کی بات یہ کہ اگر ہم بھیڑ کی سواری میں سوار ہیں تو آج ہی اس سے اتر کر ہرن کی سواری بن جائیں اور اگر اپنا تجزیہ یہ بتا رہا ہو کہ ہم ہرن کی سواری ہیں تو کبھی کبھی بیل گاڑی پر سوار ہونے کا تجربہ بھی کرنا چاہیے۔ اگر حقیقتاً آپ بیل گاڑی پر سوار ہیں تو ہر لمحہ دھیان رکھیں کہ کہیں کوئی فیصلہ کرتے وقت، کوئی موڑ مڑتے

وقت کہیں ہم بھیڑ کے ہمراہ تو نہیں چلنے لگے۔
یہی زندگی کا اصل ارتقاء ہے۔
انسانی نفسیات کے مطالعہ اور اس پر غور وفکر کی خوبصورتی یہی ہے کہ آپ جتنا سوچتے ہیں اس میں پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک ایک کر کے چھلکا اترتا جاتا ہے اور ایک نیا منظر سامنے آتا جاتا ہے، میں نے عظیم بدھا کی تعلیمات کو آپ کے سامنے رکھا اور اس میں اپنی محدود سی عقل کو استعمال کر کے اپنے نقطہء نظر کا اضافہ کر دیا ہے اور آپ کی عقلوں کو دعوت دی ہے کہ اس سے اگلے چھلکے آپ خود اتاریں گے۔
بقول اقبال
وہی جہاں ہے ترا جسے تو کرے پیدا

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

مُّبِیْنٍ، یہ عربی زبان کے مادہ بین سے نکلا ہے البین کا مطلب ہوتا دو چیزوں کو اتنی وضاحت سے الگ کر دینا جس کے بعد ان کا ملنا ناممکن ہو جائے۔ اس کا اطلاق کسی بھی چیز، معاملہ یا عقیدہ پر کیا جا سکتا ہے ۔

قرآن میں یہ لفظ مختلف اشکال میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ

بَیْنَ
الْبَیِّنٰتِ
تَبَیَّنَ
بَیَّنَّا
مُّبِیْنٌ
بَیِّنَۃٍ
تَّبَیَّنَ
الْمُسْتَبِیْنَ

اور دیگر استعمالات بھی۔ مگر جہاں بھی یہ لفظ نظر آئے تو ہم اس کے معنی دیکھتے ہیں کہ یہ روشنی دیتا ہے تاکہ ہم اندھیروں سے بچ سکیں۔ یہ ہدایت دیتا ہے تاکہ ہم گمراہی سے بچ سکیں، یہ ایمان و کفر کے درمیان ایک لکیر کھینچتا ہے تاکہ کوئی ان کو ملانے کی کوشش نہ کر سکے۔

سورتہ انعام کی آیت 59 میں یہی مادہ **كِتَٰبٍ مُّبِينٍ** کی شکل میں آیا ہے سورتہ مائدہ آیت 15، انعام آیت 59، یونس 61، ھود 6، یوسف 1، اشعراء 2، نمل 1 اور 75، سباء 3، زخرف 2 اور الدخان 3 میں بھی یہی مرکب استعمال ہوا ہے۔ جو لوگ بنیادی عربی زبان جانتے انھیں پتہ ہے کہ یہ مرکب ہے مگر ہم سب کی آسانی کے لیے اس کی گرامر کا آسان تجزیہ کرتے ہیں۔

مرکب دو یا دو سے زیادہ الفاظ کے مجموعے کو کہتے ہیں جو کچھ خاص قوانین کے مطابق ساتھ ملائے گئے ہوں اور ایک بامعنی مطلب بناتے ہوں۔ مرکب کی مختلف اقسام ہوتی ہیں جس میں ایک قسم ہے مرکب توصیفی۔ یہ ایسے مرکب کو کہا جاتا ہے جس میں کسی بھی انسان، جگہ یا چیز کی صفت بیان کی جا رہی ہو۔ مرکب توصیفی کے دو اجزاء ہوتے

ہیں پہلا جز موصوف کہلاتا ہے اور دوسرا صفت۔ موصوف عام زبان میں اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جس کی کوئی خوبی یا خامی بیان کی جا رہی ہو اور صفت اس خوبی یا خامی کو کہا جاتا ہے۔

اردو سے اس کی آسان مثال لیتے ہیں، اگر ہم کہیں کہ حامد اچھا انسان ہے تو گرامر کے مطابق حامد موصوف ہے اور اچھا انسان ہونا اس کی صفت۔ اسی کے بر عکس کہا جائے کہ فرعون ظالم تھا تو فرعون موصوف ہوا اور ظالم ہونا اسکی صفت۔

اب صفت و موصوف کو سمجھ پانے کے بعد ہم آسانی سے اس مرکب توصیفی کا تجزیہ کر سکتے ہیں کتاب موصوف ہے اور مبین ہونا اسکی خوبی یعنی صفت ہے۔

کتاب کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں اللہ اپنے قوانین، احکامات، اقوال و آیات کو کتاب کہتا ہے۔ یہ مرکب توصیفی ہمیں بتا رہا ہے کہ اللہ کے تمام قوانین ،احکامات، اقوال و آیات مبین ہیں۔ آئیے اب مبین کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بین کا مطلب ہم پہلے جان چکے ہیں کہ اس شے کو کہتے ہیں جو اتنی واضح ہو کہ اسے دوسری مخالف شے سے ملانا ناممکن ہو۔ روشن ہو یعنی ہر قسم کی تاریکی سے پاک۔ شروع میں میم کا اضافہ اس لفظ کو آگے آنے والی صفت کا حامل بنا دیتا ہے جیسا کہ

مکتب میں کتب سے پہلے میم لگا ہے اور مکتب کا مطلب ہے ایسی جگہ جسکے اندر کتب ہوں، مکتب کے باہر کتب ہوں تو اسے مکتب کہنا غلط ہوگا، لغوی اور اصطلاحی اعتبار سے بھی ۔

مقتل میں قتل سے پہلے میم لگا اور مطلب ہوگا ایسی جگہ جہاں قتل ہوتا ہو۔

مشرک اس انسان کے لیے استعمال ہوگا جس کے اندر شرک ہو۔

ایسے ہی مبین اس مواد کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے اندر وضاحت ہو، جس کے اندر روشنی پائی جاتی ہو، اگر وضاحت کی ضرورت باہر سے پڑجائے تو اسے مبین کہا ہی نہیں جا سکتا۔

پس اب آسانی سے اس مرکب **کِتٰبٍ مُّبِيْنٍ** کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے اور سمجھا بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے دیے گئے احکامات و قوانین جو نہایت واضح، روشن اور ملاوٹ سے پاک ہیں اور ان کے لیے کسی بیرونی وضاحت کی محتاجی نہیں ہے۔

یہی عربی زبان کی خوبصورتی ہے کہ اس میں ایک میم کی سمجھ آجانے سے انسان کی زندگی آسان اور آخرت خوبصورت بن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں کتاب مبین کو سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

جادوئی مشروب

آٹھویں صدی عیسوی کی بات ہے کہ ایتھوپیا میں ایک کلدی نامی چرواہا تھا۔ اپنی بکریاں چراتے ہوئےاس نے دیکھا کہ اس کی بکریاں تھکنے کی بجائے نہایت پھرتی سے پہاڑ پر چڑھ رہی ہیں۔ کچھ دن ایسا دیکھنے کے بعد وہ سمجھا کہ جب بکریاں ایک خاص درخت کے پتے اور اس پر لگا ہوا چھوٹا سا کڑوا پھل کھاتی ہیں تو زیادہ متحرک ہو جاتی ہیں۔ اس نے ان درختوں سے وہ بیر نما پھل کھایا تو کچھ دیر بعد اسے بھی اپنا آپ پرجوش اور چوکس محسوس ہوا۔ اس نے وہ پھل توڑ کر اکٹھا کیا اور ایک راہب کے پاس لے گیا۔ راہب کو کچھ سمجھ نہ آیا تو اس نے کہا کہ یہ شیطان کا کام ہے۔ اس نے وہ بیر نما پھل آگ میں پھینک دیے۔ جیسے ہی اس پھل کو آگ نے چھوا تو ایک نہایت بھینی روحانی خوشبو نکلی جس نے راہب اور چرواہے، دونوں کو مسحور کر دیا۔ راہب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے باقی بچے بیر مقدس گرم پانی میں ڈال کر رکھ دیے تاکہ خراب نہ ہوں۔

وہ راہب جب بھی اس مقدس پانی کو پیتا تو محسوس کرتا کہ اس کا دماغ جاگ گیا ہے پس راہب اس پانی کو رات کی خاص عبادات اور مراقبات میں استعمال کرتا اور آسانی محسوس کرتا۔

اس واقعہ کے سو سال بعد یمن میں ایک صوفی جو حالتِ سفر میں تھکا ہوا ایک جگہ رکا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ پرندے ایک درخت سے بیر نما پھل کھا رہے ہیں۔ وہ پرندے باقی پرندوں کی نسبت زیادہ پھرتیلے اور محرک تھے۔ اس نے اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے کچھ بیر توڑ کر کھا لیے۔ بیروں کو کھاتے ہی جیسے صوفی کی جان میں جان آگئی اور وہ تازہ دم ہوگیا۔ اس نے وہ بیر توڑ کر ساتھ رکھ لیے اور تمام سفر میں استعمال کرتا رہا۔ وہ صوفی یمن سے ایران، عراق اور ترکی بھی گیا اور جہاں جہاں سے گزرا، لوگوں کو اس معجزاتی پھل کی کرامات بتاتا رہا۔

ان بیروں سے بنا ہوا قہوہ پہلی بار 1475 میں ترکی کے شہر قسطنطنیہ کے بازار میں باقاعدہ دکان پر فروخت کرنا شروع کیا گیا۔ پھر اٹلی کے تاجر سلطنت عثمانیہ کے پھیرے لگاتے ہوئے اس قہوہ کو ساتھ اٹلی لے گئے اور یوں یہ جادوئی مشروب یورپ کے دماغوں پر جادو کرنے لگا۔

اٹلی کے شہر وینس میں اس کی پہلی دکان کھلی جہاں شہر کے امراء بیٹھ کر اس قہوہ کے پیالوں کے ساتھ کاروبار اور سلطنت کے بدلتے حالات پر تبادلہ خیال کرتے۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی اس جادو کے پیالے کو انگلستان لے گئی جہاں لندن میں اس کی بہت سی دکانیں کھلیں جن میں گورے مرد اس مشروب سے محظوظ ہوتے کیونکہ تب تک انگلستان میں عورتوں کو یہ اجازت اور سہولت میسر نہیں تھی کہ وہ دکانوں پر

مردوں کے ساتھ بیٹھ سکیں۔ یہاں سے سلیمان آغا جو فرانسیسی بادشاہ کے سفیر تھے اس مشروب کو فرانس لے گئے اور اس کے تھیلوں پر باقاعدہ جادوئی مشروب تحریر ہوتا تھا۔ فرانس کے شہر پیرس میں دھوم مچانے کے دو سال بعد ہی یہ جادو پاسکل کے ہاتھوں امریکہ میں اپنا اثر دکھانے لگا۔

اس بیروں سے بنے ہوئے مشروب کو قہوہ کہا جاتا تھا۔ اس لفظ کو، جو کہ بنیادی طور پر عربی زبان سے تھا اور ترکوں نے عربی سے مستعار لیا تھا، جب نیدرلینڈ کی ڈچ زبان میں منتقل کیا گیا تو اسے کافی (koffie) کہا گیا جو انگلستان پہنچ کر انگریزی زبان میں باقاعدہ کافی (coffee) بن گیا اور آج تک چلتا آرہا ہے۔

کافی عجیب مشروب ہے گرم علاقوں میں اگتا ہے اور سرد علاقوں یا سردی کے موسم میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ برازیل دنیا میں سب سے زیادہ کافی کی پیداوار دیتا ہے جبکہ فنلینڈ میں سب سے زیادہ کافی پی جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی سے قبل ان علاقوں میں ناشتے کے ساتھ شراب پینے کا رواج عام تھا مگر اٹھارویں صدی سے آج تک اس جادوئی مشروب نے شراب کی جگہ لے لی اور اب دنیا میں سب سے زیادہ پی جانے والی مشروب کہلاتی ہے ۔ 1932 میں جب برازیل کے پاس اولمپک کھیلوں میں شرکت کے لیے پیسے نہیں تھے تو انھوں نے کافی

بیچ کر ان کھیلوں میں شرکت کی۔ اب صرف انگلینڈ کے اندر ہی روزانہ ایک کروڑ کپ کافی پی جاتی ہے اور کافی بذات خود ایک پھل ہے۔

کافی کے بیر سبز ہوتے ہیں اور ان کو جب آگ چھوتی ہے تو یہ بدل کر گہرے براؤن رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ جادو یہ انسان کے اندر کرتی ہے اور اتنا ہی بدلاؤ لاتی ہے۔ یہ ناچیز اس کے بدلاؤ کا گواہ اور ثبوت بھی ہے۔ مجھے سوچنے سمجھنے، غور و فکر کرنے اور لکھنے میں اللہ کی عطا کردہ عقل کے بعد سب سے زیادہ سہارا اسی جادوئی مشروب نے دیا ہے۔

علم کسی بھی شے کا ہو، ضائع نہیں جاتا، چاہے coffee کا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اللہ قرآن پاک میں فرماتا ہے جو جانتے ہیں وہ بہتر ہیں ان سے جو نہیں جانتے۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

7-38-55

انسانوں کی ازل سے یہ خواہش رہی ہے کہ وہ دوسرے انسان کے دل کے اندر کی باتوں کو جان لیں، انھیں اندر سے پہچان لیں اور کسی ممکنہ نقصان یا دھوکہ سے بچ جائے۔ انسانوں کی اس شدید خواہش نے نقطہ دانوں کو مجبور کیا کہ وہ بھی اس پر سوچیں اور اس کا کوئی ممکنہ حل پیش کریں۔ اس سلسلہ میں ایک امریکی ماہر کی تحقیق خاصی مشہور ہوئی۔

صرف 7 فیصد بات الفاظ کے ذریعے پہنچائی جا سکتی ہے، 38 فیصد مقصد ہمیں انداز بیان کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور 55 فیصد پیغام باڈی لینگوئج کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ اس تحقیق کو 1971 میں چھپنے والی ایک کتاب Silent Messages یعنی خاموش پیغامات کے اندر البرٹ مہرابین نے پیش کیا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ کسی کے بھی الفاظ کو فقط 7 فیصد اہمیت دیں کیوں کہ اصل پیغام الفاظ کے اندر نہیں ہوتا، انھوں نے بتایا 38 فیصد بات کہنے والے کے انداز کے اندر چھپی ہوتی ہے پس الفاظ سے زیادہ انداز پر غور کریں تو آپ کو اصل بات تک پہنچنے میں مدد ملے گی۔ اور باقی 55 فیصد راز Body language کے

اندر چھپا ہوتا ہے۔ باڈی لینگویج یعنی بولتے وقت بات کرنے والے کی آنکھوں پر غور کریں، ہونٹوں پر آنے والی یا غائب ہو جانے والی مسکراہٹ پر نظر رکھیں یا پھر کہنے والے کے ہاتھوں کی حرکات کا مطالعہ کریں، یہ باڈی لینگویج سب سے زیادہ اہم پیغامات دیتی ہے اور سننے والے کو اس پر سب سے زیادہ دھیان دینا چاہیے۔

البرٹ مہرابین ایک بڑا نام ہیں مگر میرے خیال میں ان کی پیش کردہ اس تھیوری میں مزید کمی اور اضافہ کی خاصی گنجائش ہے۔

یہ تھیوری نہ تو کسی تحریری مواد پر لاگو کی جاسکتی ہے، نہ کسی خط یا کتاب پر اور نہ ہی کسی آرٹیکل پر، نہ کسی ریکارڈ شدہ ویڈیو یا آڈیو پیغام پر اور نہ کسی میسنجر کے میسج پر، نہ SMS پر، نہ اخباری بیان پر، نہ کسی دوسرے انسان کے ذریعے پہنچائے گئے پیغام پر، نہ فون کال پر کیونکہ ان تمام طریقوں میں ہمیں نہ تو کوئی انداز بیاں نظر آتا ہے اور نہ ہی باڈی لینگویج۔

پاکستان کے تقریباً تمام گاؤں اور شہروں میں موجود محلہ جات کی مساجد میں اعلان کرنے کا عام رواج ہے۔ چاہے کسی کے ہاں افسوسناک خبر

ہو یا خوشی کی، مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان کیا جاتا ہے اور اس اعلان کے الفاظ پر ہمیں 100 فیصد یقین کرنا ہوتا ہے۔ وہاں ایسی کوئی تھیوری لاگو نہیں کی جا سکتی۔

تو بات یہ سمجھ آتی ہے کہ اس تھیوری کا اطلاق ایسے کسی ذریعہ اظہار پر ممکن نہیں جس میں بات کرنے والا سامنے موجود نہ ہو۔ آئیے اب سامنے موجودگی والی گفتگو کا عقلی جائزہ لیتے ہیں۔

یہ تھیوری کسی مذہبی یا سیاسی تقریر، کسی اخلاقیات کے درس، کسی مزاح پر مشتمل گفتگو، کسی بے تکلف محفل، کسی انجان سے راہ چلتے بات چیت کرنے، کسی دوست کی رومانوی یا درد بھری کہانی سنتے ہوئے، کسی استاد کے لیکچر، کسی ڈاکٹر یا حکیم کے تجزیے یا کسی بچے سے گفتگو کرتے ہوئے بھی لاگو نہیں ہو سکتی۔

غور کریں کہ اللہ کے نازل کردہ احکامات ہمیں کوئی سنا رہا ہو اور ہم اس کے الفاظ پر صرف 7 فیصد غور کریں اور باقی سارا دھیان اس کے انداز گفتگو اور اشارات پر کریں تو ہم صرف اپنا نقصان کر رہے ہوں گے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس تھیوری کے مطابق صرف 7 فیصد بات الفاظ میں ہوتی ہے جس کا مطلب ہے کہ 93 فیصد بات الفاظ کے اندر نہیں ہوتی۔ یہ بذات خود اس تھیوری کے برعکس ہے کیونکہ ہمیں بھی اس تھیوری سے صرف 7 فیصد ہی لینا پڑے گا۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس تھیوری کو لاگو کرنے کے لیے ہر انسان کو گفتگو کے ساتھ ساتھ درجن دیگر علوم بھی سیکھنے ہوں گے ورنہ صرف 7 فیصد بات ہی سمجھ آئے گی۔

پس ہم یہ جان گئے ہیں کہ اس تھیوری کا اطلاق اکثر مقامات پر تو ممکن ہی نہیں اور بیشتر مقامات پر یہ موزوں ہی نہیں رہتی مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ تھیوری بے معنی اور بے مفید ہے۔ آئیں اس کا مثبت پہلو اور اطلاق دیکھتے ہیں اور شاید البرٹ مہرابین بھی یہی کہنا چاہ رہے تھے۔

اگر کوئی آپ سے محبت کا دعویٰ کرتاہے، آپ کا مخلص اور کسی اہم معاملہ یا واقعہ پر آپ سے مشورہ لے رہا ہے یا دے رہا ہے یا آپ

کی رائے لینا چاہ رہا ہے تو نہایت توجہ سے پہلے اس کے الفاظ پر غور کریں، پھر اس کے انداز گفتگو پر دھیان دیں، ہمیں لوگوں کے انداز گفتگو کی مٹھاس اور کڑواہٹ دونوں کا عام طور سے اندازہ ہوتا ہے تو ایسی خاص گفتگو کے دوران عام مٹھاس یا کڑواہٹ کو اس خاص موقع کی مٹھاس یا کڑواہٹ سے موازنہ کریں اگر فرق محسوس ہو کوئی فوری رد عمل نہ دیں اور نہایت محتاط ہو جائیں کیونکہ یہ مٹھاس بلاوجہ نہیں ہوگی، یقیناً پس پردہ کوئی پروگرام پوشیدہ ہے۔ مزید توجہ کریں تو آپ دیکھ سکتے ہیں گفتگو کرنے والی آنکھیں کیا کر رہی ہیں، ہاتھ کیا ظاہر کر رہے ہیں، گفتگو کے دوران عمومی ٹھہراؤ ہے یا ضرورت سے زیادہ وقفہ دیا جارہا ہے، ضرورت سے زیادہ وقفہ کسی مقصد کی خاطر ہوتا ہے اور ضرورت سے زیادہ بولنے کی رفتار کسی جلدی کی نشاندہی کرتی ہے اور جلدی اس لیے بھی کی جاتی ہے تاکہ آپ کو زیادہ سوچنے یا تفصیلات میں جانے کا موقع نہ ملے۔ یہ سب علامات اہم ہیں اور کسی ممکنہ نقصان سے بچانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اور یہی وہ موضوعات ہیں جہاں ہمیں 55-38-7 کا خیال رکھنا ہمارے کام آتا ہے۔

تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ نہ کوئی شے سو فیصد بے کار ہے نہ کوئی

سو فیصد کارآمد بس ہر شے کا استعمال کہاں اور کتنا کرنا ہے یہ زیادہ اہم ہے۔ صحرا میں سفر کے دوران پانی ختم ہو جائے، کہیں بھی میسر نہ ہو رہا ہو اور اچانک سے ایک ہیرا نظر آ جائے تو وہ ہیرا آپ کے کسی کام کا نہیں ہوگا اور شاید آپ وہ ہیرا چند گلاس پانی کے بدلے میں بھی دے دیں۔

اس کے برعکس دلائی لامہ کہتے ہیں کہ اگر آپ کو لگتا ہے کہ چھوٹی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں تو آپ ایک مچھر کے ہوتے ہوئے سونے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

خدا کا قہر

بچپن سے سنایا گیا کہ خدا کا قہر بہت سخت ہے اس سے بچ کے رہنا چاہیے بہت سی آفتوں ،بیماریوں اور مصیبتوں کو خدا کا قہر بتا بتا کر خدا کو قہار ثابت کر دیا گیا اور یقین مانیں تو جوانی تک آتے آتے خدا کا قہر اچھا خاصہ ڈراؤنا ہو چکا تھا کہ وہ ایسا قہار ہے اگر وہ غضب میں آجائے تو اس کا قہر پوری دنیا کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ کتابیں پڑھتے پڑھتے ایک دن قہار کی کتاب پڑھنے اور سمجھنے کا شوق ہوا تو اپنے قہار سے محبت ہوتی گئی۔ آئیے آپ کو اپنی لو سٹوری سناتا ہوں۔

عربی زبان میں ق ہ ر ایک مادہ ہے جس سے بننے والے الفاظ قہر، قہار، القاہر، قاہرون اور تقہر وغیرہ قرآن میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ قہر کا لفظی معنی ہے ایک قانون کا دوسرے قانون پر غالب ہونا۔ جو قانون بڑا ہوگا وہ چھوٹے قانون سے برتر ہوگا اور دونوں کی موجودگی کی صورت میں بڑا قانون غالب ہو جائے گا اور ایسے قانون کو قہار کہا جائے گا اور دوسرا قانون کمتر سمجھا جائے گا۔ اسکی ہر طرح کی مثالیں موجود ہیں جیسا کہ

مثبت مثال دیکھی جائے تو فوج میں ہر سپاہی کو چھٹیوں کی اجازت

حاصل ہوتی ہے اور وہ پہلے سے اپنے افسر کو بتا دیتے ہیں کہ فلاں مہینے میں مجھے اپنے گاؤں جانا ہے البتہ اس مہینے سے قبل ملک میں کوئی جنگی صورتحال بن جائے تو سب کی چھٹیاں کینسل کر دی جاتی ہیں۔
ملکی صورتحال انفرادی سپاہی کی چھٹیوں کے قانون پر قہار ہے کیونکہ اس کا تعلق ملکی سالمیت سے ہوتا ہے۔
آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ اگر کسی کو ہائی کورٹ سے سزا ہو جائے تو وہ سپریم کورٹ میں درخواست دائر کر سکتا ہے کیونکہ اگر سپریم کورٹ نے فیصلہ اسکے حق میں دے دیا تو ہائی کورٹ کا فیصلہ بے ضرر ہو جائے گا۔ پس سپریم کورٹ باقی سب عدالتوں کے موازنہ میں قہار ہے۔
منفی مثال ملاحظہ کریں کہ ہندوستان میں مغلوں کی حکومت اور قانون رائج تھا مگر 1857 کے بعد فرنگی قبضے نے فرنگی قانون کو قہار قرار دیا تاکہ ملک کے تمام فیصلے فرنگی قانون کے مطابق ہوں نہ کہ مغل قانون کے مطابق۔ یعنی فرنگی قانون مغل قانون پر قہار ثابت ہوا۔
اب ملاحظہ کیجیے قرآن میں قہر کا استعمال

قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَنَسۡتَحۡىٖ نِسَآءَهُمۡ‌ۚ وَاِنَّا فَوۡقَهُمۡ قَاهِرُوۡنَ

فرعون نے جواب دیا میں ان کے بیٹوں کو قتل کرواؤں گا اور ان کی

عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔الاعراف 127
مترجم مودودی
غور کریں فرعون چونکہ صاحب اقتدار ہے تو مصر پر اس کا اور اسکی فوج کا حکم قاہر ہے، یعنی لوگ کیا چاہتے ہیں اس کے بدلے میں یہ دیکھا جائے گا کہ فرعون کیا چاہتا ہے کیونکہ اس کے پاس اختیارات ہیں، وہ غالب ہے اور ترجمہ بھی ایسا ہی کیا گیا کہ ”ہمارے اقتدار کی گرفت مضبوط ہے“۔
پس جب اللہ نے خود کو قہار کہا تو سب بات سمجھ میں آگئی۔ ہم اللہ کی ایک پسندیدہ مخلوق ہیں اس نے ہمارے لیے آسان اور آزمودہ ترین قانون بنائے تاکہ ہم ہر طرح کی مشقت، مصیبت اور غلامی سے بچ سکیں۔ وہ ہمیں کسی کے آگے گھٹنے ٹیکتا، ماتھے رگڑتا، ذلیل ہوتا نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسی محبت کی کیفیت میں اس نے کہا میں قہار ہوں یعنی اس کا قانون دنیا کے سب قوانین سے پہلے اور اوپر ہونا چاہیے اور اس سب کا اللہ کو نہیں بلکہ صرف اور صرف ہمیں فائدہ ہونا تھا، صرف ہم نے نقصان اور غیر اللہ کی غلامی کی تذلیل سے بچنا تھا۔
یہ اس قہار کی خالص محبت تھی جو اپنی محبوب مخلوق کو عزت نفس کی مالا پہنا رہی تھی اور میں اسی اللہ کو کیسا ظالم قسم کا قہار سمجھتا تھا جو

بیماریاں، مشکلات اور مصیبتیں نازل کرتا ہے۔
سمجھ آئی تو سب سے پہلے حیرت ہوئی پھر شرمندگی ہوئی اور پھر آنکھیں نمدیدہ ہو گئیں تو خوب رویا۔ رونے سے ظالم والا قہار آنسوؤں میں ہی بہہ گیا، دل سے جب میل اتری تو ایک نہایت محبت والا قہار نظر آیا جس کا قہار قانون مجھے عزت نفس کی دولت، غلامی سے نجات، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور عمل کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔

اللہ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

پیاز کے چھلکے

پہلا سبق یہ پڑھا تھا کہ اچھے عمل کرنے چاہییں جیسا کہ کسی بھوکے کو کھانا کھلا دینا، کسی کی بیٹی کی شادی کروا دینا ،کسی کا قرض ادا کر دینا، راستے سے رکاوٹ ہٹا دینا وغیرہ وغیرہ
جہاں جہاں اور جتنا جتنا ممکن ہوسکا کوشش کرتے رہے کہ یہ سب کر سکیں۔ پھر کہیں پڑھا کہ اچھا عمل کرنے کے لیے اچھی نیت ہونا ضروری ہے۔ جب اپنا تجزیہ کیا تو پتہ چلا کہ کچھ اچھے کام کسی کی نظروں میں اچھا بننے کے لیے کیے تھے، کچھ کام دکھاوے کے لیے کیے، کچھ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں صرف برا نہیں ہوں اور کچھ اچھے کام بس بلاوجہ۔
پیاز کا چھلکا اترا تو اب نیت درست کرنے کی کوشش کرنے لگ پڑا، ہر اچھا کام کرتے وقت سوچتے رہنا اور اپنی ریاکاری کو روکنے کی کچھ کامیاب اور کچھ ناکام کوششیں کرتے رہنا، سمجھ یہ آئی کہ اچھا کام اتنا آسان نہیں ہے اس کے لیے بھی اپنے اندر جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ بہت مدت بعد یہ محسوس ہوا کہ اب اندر کا چور پکڑا گیا ہے اور اچھا کام کرتے وقت وہ باہر نہیں نکل پاتا بس اغوا شدہ انسان کی طرح جسکے ہاتھ اور منہ بندھے ہوں، آوازیں نکالنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

نیت کے منہ پر ٹیپ لپٹ گئی تو پتہ چلا کہ دکھاوے سے بچنے کے بعد بھی پیاز کا چھلکا اترتا ہے اور وہ ہم سے کہتا ہے اچھے عمل اور اچھی نیت بھی بیکار ہے اگر اخلاص نہ ہو۔ اب سوچا یہ اخلاص کیا بلا ہے؟ کہاں سے ملے گا؟ کیسے ملے گا؟

فٹ پاتھ سے خریدی ہوئی کسی پرانی اور بوسیدہ کتاب نے بتایا کہ اخلاص کسی بھی عمل کو غرض سے، ریاکاری سے، بدلے میں اچھے عمل اور شاباشی کی توقع سے اور آخر میں نیکی کے غرور سے بچ جانے کو کہتے ہیں۔ یوں نیک عمل کرنے کی فہرست چھوٹی اور اس کے بارے میں فکرمند رہنے کی فہرست لمبی ہوتی گئی۔ اب ہر عمل کو کرنے سے پہلے ایک فہرست اور ہر عمل کو کرنے کے بعد ایک فہرست، عمل چھوٹا ہوتا تھا فہرست لمبی ہوتی تھی۔

آخر میں کسی تصوف کی کتاب میں پڑھا کہ عمل بھی ہو، نیت اچھی درست ہو، ریاکاری اور غرور بھی پیدا نہ ہو، اخلاص بھی مکمل ہو تو بھی عمل مقبول نہیں ہے کیونکہ یہ مالک کی مرضی ہے وہ قبول کرے یا نہ کرے۔ یہاں آکر تو پیاز نے بھی مزید چھلکے اتارنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے بعد کچھ بچا ہی نہیں۔ صوفی صاحب نے میرا وہی حال کیا جو بقول شاعر

جنھیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

پہلے مالک ہم سے کہے کہ فلاں کام کرو جب ہم کر چکے ہوں تو وہ کہے ٹھیک ہے کرتے رہو میں آخر میں بتاؤں گا مجھے پسند آیا کہ نہیں مزدور سے مزدوری کروائیں، سارا دن اس کے کام پر نظر رکھیں اور شام کو دیہاڑی دیتے وقت بولیں کہ مجھے کام پسند نہیں آیا اس لیے کوئی تنخواہ نہیں ملے گی۔

اس موضوع پر زیادہ نہیں بول سکتا پہلے پر جل جاتے تھے

اب گھر جل جاتے ہیں بس وزیر علی کے شعر پر ہی اکتفا کروں گا

آپ ہی اپنے ذرا جورو ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

پھر مطالعہ بڑھا، ملک سے باہر نکلے، تھوڑی دنیا دیکھی تو مزید چھلکے اتر گئے، وہاں زیادہ تر افراد اچھے عمل نہیں کرتے بلکہ صرف عمل کرتے ہیں۔ انھیں یہی سکھایا گیا ہے کہ بس عمل کرتے جاؤ۔ عمل کرتے رہنا ہی سب سے اچھا عمل ہے۔ اس لیے ان کے پاس عمل سے پہلے اور بعد والی فہرست نہیں ہوتی، بس عمل ہوتا ہے۔ اگر کوئی عمل غلط ہو گیا تو اس کو درست کرنے کا بھی ایک عمل ہے، عمل پھول کی طرح ہوتا ہے اس میں سے خوشبو نکالنی نہیں پڑتی، خود بخود باہر آتی ہے کیونکہ یہی اس کی سرشت ہے۔ ان لوگوں کی سرشت میں عمل روزمرہ کی

چیز ہے کسی کو صحیح راستہ بتا رہے ہوں یا صحیح سامان بیچ رہے ہوں وہ اسے اچھا عمل سمجھ کر نہیں کرتے بلکہ ذمہ داری سمجھ کہ کرتے ہیں اور ذمہ داری روز نبھانے سے ذمہ داری نہیں رہتی عادت بن جاتی ہے اور عادت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی، وہ ہوتی رہتی ہے۔ پھر عادت کے بعد کسی فہرست کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ وہ معمول بن چکی ہوتی ہے ۔

ایسے باعمل انسان پیاز کے چھلکوں کی طرح رنگ نہیں بدلتے بلکہ گلاب کی طرح پہلے کلی پھر پھول اور پھول کی بکھری ہوئی پتیاں الغرض کسی بھی حالت میں ہوں صرف خوشبو پھیلاتے رہتے ہیں اور پھول خوشبو پھیلا کر نہ تو غرور کا شکار ہوتا ہے نہ ریا کاری کا، بس اپنا کام کرتا ہے، روزانہ، بلا ناغہ ۔ بالکل ایک پرانی عادت کی طرح۔

باعمل انسان کسی ہجوم کا محتاج نہیں ہوتا ۔ میاں محمد بخش صاحب لکھتے ہیں۔

قدر پھلاں دا بلبل جانے صاف دماغاں وال
قدر پھلاں دا گرج کی جانے مردے کھاون والی

پھول کی قدر بلبل کر پاتی ہے کیونکہ اس کا دماغ صاف ہوتا ہے، اسکی خوراک صاف ستھری چیزوں میں ہے اور اسکی آواز سکون پہنچانے کا

باعث بنتی ہے۔
پھول کی قدر گدھ نہیں کر سکتا کیونکہ گدھ کی خوراک مردار جانور ہیں، مردار سے بدبو آتی ہے مگر گدھ اسے پھر بھی شوق سے کھاتا ہے کیونکہ اسے شکار نہیں کرنا پڑتا، عمل نہیں کرنا پڑتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

صرف دو کام

یقین جانیے ہمیں صرف دو کام کرنے ہیں اور پھر ہمیں ترقی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔
قطر ائیرپورٹ پر فرنگیوں کی تعداد دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ پایا کیونکہ اتنے فرنگی تو کبھی دبئ میں نظر نہ آئے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ قطر کی حکومت اور عوام نے وہ دو کام کر لیے ہیں۔
مجھے ہر شے کو پرکھ کر سمجھنے کی اتنی عادت پڑ چکی تھی کہ میں نے قطر کے بارے میں اپنے اس ذاتی تجزیے کو ایئرپورٹ سے ہی پرکھنے کا ارادہ کیا۔ میرے ہاتھ میں میرا لیپ ٹاپ بیگ تھا میں نے اسے ایک جگہ رکھا اور خود وہاں سے غائب ہو گیا۔
قطر ایئرپورٹ بذات خود ایک الگ دنیا ہے یہاں آپ کو مہنگی ترین یورپین کپڑوں کی دکانیں، اعلیٰ ترین فانوس اور ڈیزائن، عجوہ کھجور سے لیکر آئرش وسکی تک تمام مہنگی مصنوعات، جرمن کاریں اور امریکی ہیرے دستیاب ہیں۔ اسی ائیرپورٹ کے اندر ہی ایک خوبصورت باغ ہے۔ یہ چند درختوں اور گرتے پانی کے فواروں پر مشتمل ایک ایسی جگہ ہے جو ایئرپورٹ کے اندر ہی آپ کو فطرت کے نہایت قریب لے جاتی ہے اور وہاں جا کر آپکا جلدی واپس آنے کو دل نہیں کرتا۔

آپ گھنٹوں وہاں بیٹھ کہ درختوں سے آنے والی قدرتی مہک اور انسانی بلڈ پریشر کو نارمل کرنے والی گرتے پانیوں کی آواز سے مسحور ہو سکتے ہیں۔
پھر ایک مہنگا سا کافی کا کپ پیا کیونکہ سستا میسر نہیں تھا اور اس کے بعد میں اسی جگہ کی طرف واپس چل پڑا جہاں بیگ رکھا تھا۔ وہاں پہنچا تو میرا بیگ غائب تھا اور میرے پرکھنے کی بیماری نے میرے لیے ایک پریشانی کھڑی کر دی تھی۔ میں نے کچھ منتظر مسافروں سے پوچھا تو انہوں نے مجھے سمجھایا کی ایسا کچھ بھی مسئلہ ہو جائے تو آپ انفارمیشن کاؤنٹر پر جا کر بتا سکتے ہیں۔ وہاں ایک محمد نامی عرب نوجوان بیٹھا تھا جس نے میرا مسئلہ سننے کے بعد وائرلیس فون سے عربی میں ایک اعلان کیا جسے میں اتنا ہی سمجھ پایا کہ لیپ ٹاپ بیگ کی ہی بات کر رہا ہے۔
کچھ دیر بعد ایک سیکورٹی گارڈ وہ بیگ لے کر آگیا۔ اسنے مجھ سے بیگ کے اندر موجود کچھ اشیاء کے بارے میں سوال پوچھا جو میرے بتانے پر بیگ مجھے دے دیا گیا۔ میں نے محمد کا شکریہ ادا کیا اور اسکے ساتھ ایک فوٹو بنائی اور اگلی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ آپ محمد کے چہرے پر غور کریں، لیپ ٹاپ مجھے ملا تھا اور میری مدد کرنے پر وہ مجھ سے بھی زیادہ خوش تھا۔

واپس اپنے وطن پہنچ کر بھی مجھ سے رہا نہیں گیا اور قطری حکومت پر تحقیق کی کہ انھوں نے پچھلے کچھ عرصے میں کیا ایسا جادو کیا ہے جو پوری دنیا سے فرنگی ان کے ہاں کاروبار کرنے اور کھیلنے پہنچ گئے ہیں۔

2022 کا فٹبال ورلڈ کپ قطر میں منعقد ہوا جس کی تقریب میں ہالی وڈ کے جانے مانے ایکٹر مورگن فری مین کو بلایا گیا اور ان کے ساتھ قطر کے 20 سالہ غنم المفتاح تھے جو اپاہج پیدا ہونے کے باوجود 2017 میں نوجوان ترین کامیاب اور مقبول جوان کا ایوارڈ جیت چکے ہیں۔ دنیا بھر سے فٹبال کے شوقین یورپین، امریکن، لاطینی، افریقی اور ایشیائی افراد کا ہجوم تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری دنیا اس وقت یا تو قطر میں موجود تھی یا ٹی وی کے ذریعے اس تقریب کو دیکھ رہی تھی اور اس تقریب کا آغاز غنم المفتاح نے حیران کن طور پر سورتہ حجرات کی اس آیت سے کیا

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّاُنۡثٰى وَجَعَلۡنٰكُمۡ
شُعُوۡبًا وَّقَبَآٮِٕلَ لِتَعَارَفُوۡا‌ ؕ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰٮكُمۡ‌ ؕ

ترجمہ: اے انسانوں ہم نے تم سب کو مذکر اور مونث سے پیدا کیا، اور تمھارے درمیان صرف تعارف کے لیے قومیں اور قبائل قرار دیے۔ اللہ کے نزدیک صاحب عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ قانون توڑنے سے بچتا ہے۔

سوچیں کیا پیغام دیا جا رہا ہے، کیسے دنیا کو بتایا جا رہا کہ جس قرآن کو جلانے کو تم بہادری سمجھتے ہو وہ تمھارے بارے میں ہی بات کرتا ہے اور تمھیں مذہب کی بجائے تمھارے کردار کے معیار پر پرکھتا ہے۔ تم پوری دنیا میں آج جسے سب سے زیادہ پسندیدہ شہری یعنی Law Abiding Citizen کہتے ہو اس بات کو ہمارا قرآن چودہ سو سال پہلے متقی کہہ کر دہرا چکا ہے۔ ہم بھی اسی متقی کو سب سے زیادہ قابل احترام سمجھتے ہیں۔ ہمارے لیے تمھاری رنگت، زبان یا شہریت سے کہیں زیادہ تقویٰ اہم ہے۔ ہم قانون توڑنے اور توڑنے والے کو کبھی عزت نہیں دیتے کیونکہ ہمارے قرآن نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔

قطری حکومت کی دستاویزات میں سے ایک جملہ میری آنکھوں کو بھا گیا وہ کچھ اس طرح ہے۔

Justice and equality and promoting tolerance and sympathy for other cultures

عدل اور مساوات کو ایسے بڑھایا جائے کہ دوسری قوموں کے تمدن کو سمجھتے ہوئے ان کے لیے قبولیت کا جزبہ پیدا کیا جائے۔

یہ ایک جملہ ان کے پورے عقلی وجدان کی عکاسی کے لیے کافی ہے اور

وہ بحیثیت قوم اس ایک جملے پر عمل پیرا ہوچکے ہیں۔ یہی عقلی وجدان ان سے وہ دو کام کروانے میں سب سے بڑا مددگار ہے۔

پہلا وہ اپنے اور اپنے ملک میں آنے والے سب افراد کی عزت، جان اور مال کا دل و جان سے احترام اور حفاظت کرتے ہیں

دوسرا وہ اپنے اور باہر سے آنے والے افراد کے رنگ و نسل سے آزاد ہو کر ان کے لیے یکساں کاروباری مواقع مہیا کرتے ہیں۔

ہمیں بھی انھی دو باتوں پر عمل کرنا ہے اور اپنے آنے والی نسل کو بھی یہی سکھانا ہے کہ بس دو کام کرنے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کارنامے

میرے ایک انکل ہیں انیسویں گریڈ سے ریٹائرڈ ہیں، ڈیفنس میں ان کا اپنا گھر ہے دو بیٹے ہیں ایک ڈاکٹر ہے اور دوسرا انگلینڈ میں نوکری کرتا ہے ان کو کسی نے بتایا کہ فلاں گاؤں میں کسی ایک آدمی نے نبی کی شان میں گستاخی کی ہے وہ گھر سے اپنی گاڑی میں نکلے اس گاؤں میں پہنچے اور اس آدمی کو گولی مار دی اور کہا کہ نبی کی شان کے آگے کوئی چیز بھی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ ڈیفنس کی آرام دہ رہائش چھوڑ کر آجکل جیل میں ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا ننکانہ میں ایک عیسائی عورت نے بھی ہمارے نبی کی شان میں گستاخانہ الفاظ بولے تھے۔ میرا ایک کزن ہے جو امریکہ میں مقیم ہے گرین کارڈ ہولڈر ہے اس نے وہاں سے سب کچھ چھوڑا اور ننکانہ پہنچ کر اس عورت کا اپنے ہاتھوں سے گلہ گھونٹ دیا اور خود تھانے پہنچ گیا کہ ہاں میں نے مارا ہے کیونکہ اس نے میرے نبی کی بے حرمتی کی ہے۔ اور نبی کی شان کے آگے میں امریکہ کی شہریت پر بھی لعنت بھیجتا ہوں۔

ایک تیسرا واقعہ کچھ اس طرح ہوا کہ کسی نے خانیوال میں قرآن کو

کوڑے دان میں پھینکا تھا تو ہمارا ایک کلاس فیلو جو اسلام آباد میں اپنی موبائل کی کمپنی چلا رہا تھا اور اس کے دبئی اور سعودی عرب میں بھی اپنے دفاتر تھے اور سینکڑوں لوگ اس کے ہاں ملازمت کرتے تھے، اسے معلوم پڑا تو وہ اسلام آباد سے اپنی مرسڈیز گاڑی میں اپنے گارڈز کو ساتھ لے کر نکلا اور خانیوال پہنچ کر اس آدمی کو جہنم واصل کر دیا کیونکہ میرے کلاس فیلو کو قرآن سے عشق تھا۔

آپ پچھتر سالہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیئے اس ملک میں کبھی ایک بھی ایسا یا اس سے ملتا جلتا واقعہ پیش نہیں آیا ہوگا۔ کیا وجہ ہے؟

کیوں ہمیشہ کوئی غریب، ریڑھی والا، چھوٹی سی دکان والا، عام سی پرائیویٹ ملازمت کرنے والا یا کچھ بھی نہ کرنے والا ہی کیوں ایسے کام کرتا ہے؟
میں آپ کی عقلوں کو دعوت دے رہا ہوں کہ آپ جذبات سے تھوڑا بلند ہو کر غور و فکر کریں یا تحقیق کر کے دیکھیں پرانے اخبارات اور انٹرویوز کی ویڈیوز کو سنیں یا جا کر ان علاقوں میں عوام کو مل لیں، آپ یقیناً کوئی ایک بھی ایسا بندہ تلاش نہیں کر پائیں گے جیسے اوپر تین مثالوں میں بیان کیے گئے ہیں۔

دوسرا میں آپ کو تجزیہ کرنے کی دعوت بھی دیتا ہوں آپ ایسے کام کرنے والوں سے مذہب کے متعلق چند بنیادی سوال پوچھ کر دیکھ لیں آپ حیران ہوں گے کہ نبی کی شان میں گستاخی اور قرآن کی بے حرمتی پر سیخ پا ہونے والے افراد کو اپنے مذہب کے متعلق دس بنیادی سوالوں کے جواب بھی معلوم نہیں ہوں گے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں؟

دو دہائیوں سے انسانی نفسیات کا طالب علم ہونے کے ناطے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہر عمل کے پیچھے ایک سوچ پنہاں ہوتی ہے اور اس سوچ کو بھی پیدا کرنے والی کچھ محرکات و وجوہات ہوتی ہیں۔ جب آپ ان وجوہات تک پہنچتے ہیں تو آپ جان لیتے ہیں کہ ایسی سوچ کیوں پیدا ہوئی اور آپ یہ بھی سمجھ جاتے ہیں کہ ایسی سوچ کو ابھارنے سے کون کون سے کارنامے سرزد ہوں گے۔

اس طرح کے کارناموں کی وجوہات میں مجھے کہیں بھی مذہب، قرآن یا نبی سے عشق نہیں مل سکا، آپ بھی تلاش کریں اور مجھے ضرور آگاہ کریں اس بارے میں ۔ جہاں تک میری ذاتی رائے ہے ان تمام کارناموں کے پیچھے جو سوچ ہے اور اس سوچ کو پیدا کرنے والے سب سے بڑے ذرائع مذہب یا عشقِ رسول نہیں بلکہ ایسے انسانوں کی نہایت

بیزار، ناکام معاشی و معاشرتی زندگی اور غربت و افلاس سے بھرپور بھڑاس ہے جو وہ کہیں اور نکالنے میں کامیاب نہیں ہو پائے تو انھیں اس ایک کارنامے کے پیچھے اپنی ساری ناکامیاں چھپتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ایک مصنوعی اہمیت حاصل کرنے کے لیے جو انھیں اپنے جیسے غربت کے ستائے ہوئے افراد کے بیچ میں ہی ممکن ہو سکتی ہے وہ پانے کی تمنا کیونکہ اس کے علاوہ تو انھیں کبھی یہ سہولت میسر ہی نہیں ہوئی نہ ہونے کی کوئی امید باقی ہوتی ہے۔

کبھی معاشی طور پر خوشحال اور معاشرے میں کوئی بڑا معزز آدمی کیوں یہ کارنامہ نہیں کر پاتا، جواب آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ کیا احترام نبی اور حرمت قرآن کا غربت یا امارت سے بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ جواب آپ خود اخذ کیجیے

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

تین دوست تین کہانیاں

حماد صاحب کو بہت کم ہی غصہ آتا ہے، ذاتی زندگی میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں عید کے علاوہ نئے کپڑے نہیں بناتے اور جوتا تو پہلی ملاقات سے لیکر آج تک ایک ہی پہلی محبت کی طرح ان سے لپٹا ہوا ہے، کنجوسی کا عالم یہ ہے کہ زیادہ وقت وہ سنجیدہ رہتے ہیں بہت کم ہنستے ہیں، ہنسنے کی جگہ مسکرانے سے کام چلا لیتے ہیں۔ آپ کسی کے خلاف گھنٹے کی تقریر کریں اور جوش دلانے کے بعد جب انکی طرف دیکھیں گے تو بدلے میں وہ پنجابی میں بولیں گے "چلو مٹی پاؤ" یہی کنجوسی وہ غصے کے معاملے میں بھی کرتے ہیں۔ واحد موضوع جس پر ان کو جوش خطابت کرتے دیکھا ہے وہ مذہب ہے۔ مذہب کے وہ اتنے خلاف ہیں جتنا ہمیں بچپن سے بتایا جاتا ہے کہ ہم اسرائیل کے خلاف ہیں۔ حس مزاح عروج پر اور تنقید کمال پر ہے۔ عام لوگ انھیں "کھسکا" ہوا سمجھتے ہیں مگر وہ ایک شاطر شکاری مگر مچھ کی طرح گفتگو میں مدمقابل کو تالاب کے بیچ میں لے جاتے ہیں اور تالاب کے بیچ کا مگر مچھ بادشاہ ہے اسے کوئی ہرا نہیں سکتا۔

مذہب کے متعلق جوش خطابت میں آتے ہی ان کی زبان پنجابی میں گلفشانی کا آغاز کر دیتی ہے اگرچہ خود نہایت مذہبی خاندان سے تعلق

رکھتے ہیں ہر سال ان کے گھر سے عمرہ ادا کیا جاتا ہے خاص راتوں میں خاص عبادات کا اہتمام ہوتا ہے مگر حماد صاحب ایک تو ان سب سے دور رہتے ہیں اور دوسرا اس کے خلاف چپ نہیں رہ پاتے۔ ہم تینوں دوستوں نے مل کر سوچا کہ حماد صاحب کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اسی سلسلہ میں ایک دوست ان کو اپنے پیر صاحب کے پاس لے گئے دعا کروانے، کہا کہ ان کو شیطانی خیالات بہت آتے ہیں آپ دعا کریں کہ ان کو خیالات آنے بند ہو جائیں اور شیطانی حملے رک جائیں تاکہ شاید حماد صاحب کو ہدایت نصیب ہو، پیر صاحب نے دعا کی تو حماد صاحب نے حسب معمول جملہ پھینکا کہ

"آپ کے ہاں اولاد کرامت یا جادوئی انداز سے ہوئی تھی یا آپ کو بھی ہماری طرح مرد و عورت کا اختلاط کرنا پڑا؟"

ہمارے تیسرے دوست نے حماد صاحب کو گھورا مگر پیر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا

"میاں ہم انسان ہیں کوئی فرشتہ نہیں ہیں ہمیں بھی سب تقاضے انسانوں کی طرح ہی پورے کرنے ہیں اسی میں حق زوجیت بھی شامل ہے۔"

حماد صاحب نے جیسے پچھلی بات سنی ہی نہیں اور بولے

"حضرت جب آپ کو پیشاب آتا ہے تو آپ لیٹرین جاتے ہیں یا دعا سے کام چل جاتا ہے؟"

یہ کہنے سے محفل میں پہلے تو ایک سناٹا ہوا پھر پیر صاحب نے مشکل سے خود کو سنبھالا اور ماحول کو لفظوں کے لبادے میں سمیٹتے ہوئے کہا

"انسان ایک طبعی مخلوق ہے اور فطرت کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے اس کو پسینہ آتا ہے، بھوک پیاس بھی لگتی ہے اور اسی طرح اس نے لیٹرین بھی جانا ہوتا ہے۔"

حماد صاحب اپنے فاتحانہ انداز سے اٹھے اور بولے

"آجا چلیئے، انہاں کولوں پیشاب تہ رکدا نئیں شیطان کنے روکنا اے"

اردو: اٹھو چلیں، ان سے اپنا پیشاب تو رکتا نہیں یہ شیطان کے حملے کو کیا روکیں گے۔

ایک ہمارے دوست مدرسہ سے منسلک ہیں اور ایک مفتی صاحب کے زیر نگرانی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے ہاں ایک سالانہ اجتماع ہوتا ہے جسکا نام غالباً یوم اصلاح امت رکھا گیا ہے۔ وہ اس اجتماع پر حماد صاحب کو لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں شریک نہیں ہو سکا مگر رُوداد سن پایا جو یوں تھی کہ حماد صاحب نے مفتی صاحب کو پوچھا

"کیا حلالہ حلال ہے؟"
مفتی صاحب نے تفصیل سے بتایا کہ کس کس صورت حال میں جائز ہے تو حماد صاحب بولے کہ

"آج تک اس مدرسے سے کتنے حلالہ کے فتوے جاری کیے گئے ہیں"

مفتی صاحب بولے کہ

"صحیح تعداد تو نہیں معلوم مگر گزشتہ چند سالوں میں کوئی پندرہ بیس معاملات تو ہوئے ہونگے۔"

حماد صاحب بولے

"مفتی صاحب اگر اگلی دفعہ کوئی بھی ایسا معاملہ مدرسہ کے لوگوں کے خاندان میں سے آجائے اور آپکا فتویٰ بھی موجود ہو تو حلالہ کرنے کے لیے مجھے ضرور یاد رکھیں، میں اس کارِ خار میں فی سبیل اللہ اپنا حصہ ڈالنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مفتی صاحب کا دماغ اور زبان دونوں بھول گئے کہ وہ مفتی ہیں اور اپنے طلباء کے بیچ بیٹھے ہیں۔ المیے کی بات یہ تھی کہ ہمارے دوست جب حماد صاحب کو بازو سے پکڑ کر مدرسے سے باہر لا رہے تھے اور پیچھے سے مفتی صاحب اونچی آواز میں غزلیں سنا رہے تھے تو حماد صاحب مڑ مڑ کے ان کو ایک ہی بات کہتے تھے

"اک واری تسی مفتی تہ اک واری میں مفتی"

میرے ایک بہت پرانے دوست ہیں جو پہلے ایک سرکاری کالج میں پروفیسر تھے، پھر پرنسپل بنے اور اب ریٹائرمنٹ لے چکے ہیں، سائیکالوجی میں پی ایچ ڈی ہیں اور ان موضوعات پر خاصہ عبور رکھتے ہیں۔ ہم دوستوں نے مل کر سوچا کہ حماد صاحب کو ان سے ملواتے ہیں۔ ملاقات بہت اچھی رہی، سیاسیات، سماجیات، معاشیات، جنسیات اور نفسیات تک گفتگو کا دائرہ پھیلتا رہا۔ حماد صاحب کو خلافِ معمول پروفیسر صاحب پسند آئے اور نہایت بے تکلفی سے محفل جمی رہی۔ میں پروفیسر صاحب کو پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا کہ ہمارے دوست کھسکے ہوئے ہیں لہذا آپ نے ان کی کسی بات کا برا نہیں منانا اس لیے پریشانی نہیں تھی کہ یہاں وہ کوئی کمال دکھائیں گے۔ آخر میں آخرت کے موضوع پر بات ہو رہی تھی تو پروفیسر صاحب نے اظہار خیال کیا

"خدا کو ماننے والے مذاہب میں آخرت کا تصور مجبوری ہے کیونکہ اس کو ماننے سے ابتدا اور ابتدا کرنے والے کو ماننا آسان ہو جاتا ہے اور بندہ ابتدا کرنے والے کے بارے میں کم سوچتا ہے کیونکہ وہ آخرت سے ڈر رہا ہوتا ہے اس لیے آخرت ضروری ہے اور دوسری آسانی یہ بھی ہے کہ کسی سے بھی یہ منوانا آسان ہے کہ اگر تمھارے مرنے کے ہزار سال بعد قیامت آگئی تو اسے سکون ہوتا ہے کہ چلو ابھی تو

زندگی گزارو ہزار سال بعد کی بعد میں دیکھیں گے، انسان کی یہ سہل پسندی آخرت کے وجود پر یقین میں آسانی پیدا کر دیتی ہے۔"

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے حماد صاحب سے پوچھا کہ

"آپ کو ڈر نہیں لگتا اگر آخر میں اللہ نے آپ سے کچھ سوال و جواب کر لیے تو آپ کیا کہیں گے؟"
پرفیسر صاحب نے بات اتنے نفیس انداز سے اور مدلل طریقے سے کی تھی کہ حماد صاحب اس کا کوئی غیر مناسب جواب دے نہ سکتے تھے، انھوں نے کچھ دیر سوچا اور پھر وہ نہایت اعتماد سے بولے

"ایس بارے میری اللہ نال گل ہوئی اے، اوہ کہندا اے جے ایس زندگی وچ تو ایناں کنجراں کولوں بچ گیا تہ آخر وچ وی بچ جائیں گا"
اشارہ ہماری طرف تھا

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے

محبت کا نقص

محبت بے اختیاری جذبہ ہے یہ چند لمحوں میں کسی بھی راہ چلتے انسان کے ساتھ، کسی کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار کے، کسی شے، کسی منظر یا کسی نظریے کے ساتھ اچانک سے ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے کسی پلان کی، ارادے کی یا تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ صبح گھر سے نکلتے وقت سوچیں کہ آج کسی سے محبت کرنی ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ کسی کے ساتھ ہم بہت وقت گزاریں، سالوں گزر جائیں تو محبت لازماً ہو جائے گی۔ نہیں ہو سکتی نہ ہونی چاہیے کیونکہ یہ ایک نفسیاتی جزبہ ہے اور علم نفسیات کے مطابق یہ اچانک سے نمودار ہو جاتا ہے جبکہ اس کی کوئی ظاہری وجہ بھی معلوم نہیں ہوتی ۔

مجھے یقین ہے آپ یہاں تک میرے ہم خیال ہوں گے کیونکہ میں نے کوئی نئی یا حیران کن بات نہیں کی۔ اگر آپ کو بھی اوپر لکھے گئے

جملوں سے اتفاق ہے تو پھر میں آپ کے آگے کچھ سوال رکھنا چاہتا ہوں، آپ ان کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں، سوچیں ، تحقیق کریں اور جاننے کی تگ و دو کریں۔

اگر محبت بے اختیاری جزبہ ہے اور یہ ہم اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے تو میرا سوال ہے کہ پھر

اللہ کی محبت لازم و ملزوم کیسے ہو سکتی ہے؟
اللہ کے نبی کریم سے محبت مسلمان کے ایمان کا حصہ کیسے ممکن ہو گی؟
کیا تمام صحابہ سے عشق ہونا یا اہل بیت کی محبت کے بغیر ایمان نامکمل ہونا ایمان کی نشانی ہے؟ یا اس طرح کے تمام اقوام جو ہم تک پہنچے ہیں ان پر عمل کرنا ممکن ہے اور عمل یعنی محبت نہ ہو پائی تو ایمان ادھورا ہی رہ جائے گا؟

کیا ایسا ممکن ہے کہ دنیا میں دو عرب مسلمانوں کو اللہ اور اسکے رسول سے واقعی محبت ہو؟

کیا محبت اختیاری جزبہ ہے؟ ہر گز نہیں

جو چیز میرے اختیار میں نہیں وہ مجھ پر فرض ہونی چاہیے؟ اور کیا ایسا ہو تو یہ عدل کہلائے گا؟ مچھلی پر فرض کر دینا کہ وہ درخت پر چڑھے گی تو اس کا ایمان مکمل ہوگا۔

یہ سوال میں نے علماء، فقہاء اور دانشوروں سے بھی کیا اور ان سب سے پہلے یہ سوال میں نے اپنے آپ سے بھی کیا۔ آپ بھی یہ سوال خود سے پوچھیں کہ کیا ہم زبردستی کسی شخص، چیز، کتاب یا جزبہ کے ساتھ محبت کر سکتے ہیں؟

اگر کر سکتے ہیں تو وہ طریقہ مجھے بھی سکھائیے گا کیونکہ پھر مجھے بھی بہت سے لوگوں اور نظریوں سے محبت کرنی ہے اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے۔

اگر انسان ایسا کر ہی نہیں سکتا تو سوچیے گا کہ اس طرح کے تصورات پیدا کرنے والے کیا چاہ رہے تھے؟

میں نے محبت کی نشانیوں پر تحقیق کی تو پتہ چلا کہ محبت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ محبت میں نقص نظر نہیں آتا، سامنے ہونے کے

باوجود ہمارا دماغ اس کی طرف دھیان ہی نہیں کرتا، دھیان چلا بھی جائے تو فوراً جھٹک دیتا ہے، یہی محبت کی سب سے بڑی نشانی ہے اور اس بات پر تمام ماہرین نفسیات متفق ہیں۔

کہیں ہم سے کوئی نقص چھپانے کی کوشش تو نہیں کی جا رہی تھی؟

سوچیے ضرور کیونکہ سوچنا حکم الٰہی ہے اور نہ سوچنا نا فرمانی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

صاحبہ و صاحب ۔ قسط نمبر 1

آپ کو پتہ ہے عورتوں کے بہت سے نام مردانہ ناموں میں سے نکال کر رکھے گئے ہیں مثلاً

رضوانہ
طاہرہ
صدیقہ
جمیلہ
شکیلہ
نفیسہ اور دیگر سینکڑوں

یہ پرانے عربی نام ہیں جس میں مذکر نام کے آگے ۃ لگا دی جاتی تھی اور مونث نام بن جاتا تھا ۔ اس کے پس پردہ کچھ تاریخی اور معاشرتی حقائق ہیں جو چند صدیاں قبل از اسلام سے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب عورتوں کے حقوق کی بجائے عورتوں کے استعمال پر قوانین مرتب کیے جاتے تھے کہ جب کسی کا باپ مر جائے گا تو وہ

وہ کس کی ملکیت ہوگی جب کسی کا خاوند نہیں رہے گا تو کس کی خادمہ یا باندی بنے گی، جس کا کوئی مالک نہیں ہوگا اس کا مالک کون سا مرد ہوگا۔ ان سب مراحل کے دوران یقیناً کسی عورت سے پوچھنا کہ اس کے ساتھ کتنا اور کیسا برا سلوک کیا جائے، ہر گز ممکن ہی نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اسی دور میں ایک قبیلہ میں یہ رواج بھی قائم تھا کہ سردار کا بیٹا ہی اگلا سردار ہوگا اور یہ سلسلہ کامیابی سے چلا آ رہا تھا۔ ایک سردار کے ہاں اولاد نہیں ہوئی، اس کی بیوی کا بہت علاج کروایا گیا مگر بے سود۔ سردار نے بہت سی شادیاں کیں مگر پھر بھی نامراد رہا کیونکہ ہر بار اولاد نہ ہونے پر آنے والی سردارنی کا ہی علاج کیا جاتا تھا۔ آخرکار وہ بوڑھا ہو گیا تو اس نے کچھ سیانوں کو مشورہ کے لیے بلوایا جس میں اس کا مشیر خاص بھی شامل تھا۔ جب ان سب نے اس مسئلہ کو سنا تو متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ سردار کی ایک اور شادی کی جائے اور اس بار ایسی لڑکی تلاش کی جائے جو لاوارث ہو مگر حاملہ ہو۔ خوب تلاش کے بعد ایسی لڑکی سے شادی کر دی گئی اور یوں سردار کی نرم دلی اور صلہ رحمی کا ڈنکا بجایا گیا کہ سردار نے ایک بے سہارا اور حاملہ کو اپنے محل کی شان بنا لیا۔
چند ماہ گزرنے کے بعد اس نئی سردارنی کے ہاں جب اولاد ہوئی تو لڑکی

پیدا ہوئی۔ لڑکی کا نام مشیر خاص کی مشاورت سے صاحبہ رکھا گیا۔ اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ قبیلہ کی سردار ایک لڑکی کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر سیانے بیٹھ گئے کہ سرداری کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے کیونکہ ان کا قانون، رواج اور غیرت گنوارا ہی نہیں کر سکتی تھی ایک عورت کو سردار کے طور پر۔

خیر وقت گزرتا گیا، لڑکی جوان ہو رہی تھی اور معاملہ جوں کا توں تھا کہ سردار کا انتقال ہو گیا۔ کچھ روز بعد جب سرداری کا معاملہ قبیلے میں درپیش ہوا تو پھر سے سب سیانے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ مشیر خاص نے تمام سیانوں کو جو کہ سب مرد تھے، یہ بتایا کہ اگر لڑکی کو سردار بنا بھی دیا جائے مجبوری میں تو لڑکی کا نام صاحبہ ہے، صاحبہ ادھورا نام ہے کیونکہ صاحبہ کسی صاحب کی ہی ہو سکتی ہے، بغیر صاحب کے صاحبہ کا وجود کیسا، تمام قبائل ہمارا مذاق اڑائیں گے۔

عرب چونکہ اپنی زبان پر فخر اور عبور رکھتے تھے، اس کے کلام اور ادب کے قائل تھے اس لیے یہ ماننا کوئی مشکل نہ تھا کہ صاحبہ جس کا کوئی صاحب نہ ہو وہ حکمران نہیں ہو سکتی۔ یہ خلاف منطق و اصولِ زبان تھا۔

کافی غور و خوض کے بعد یہ طے پایا کہ مشیر خاص کا بیٹا جو لڑکی سے دو سال بڑا بھی ہے، جس کا نام صاحب ہے اس سے لڑکی کا بیاہ کر دیا جائے اور اسی لڑکے کو قبیلے کا سربراہ مقرر کیا جائے، اس طرح سردار کا گھرانہ بھی سرداری میں شامل رہے گا اور زبان کے اصولوں کے اعتبار سے صاحب حکمران ہوگا اور صاحبہ اس کے زیر اطاعت۔

یہ واقعہ اتنا ہی ہے مگر اس کے اثرات صدیوں تک مردوں کے ازہان پر ایسے ثبت کر دیے گئے کہ وہ کسی صاحبہ کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کر پائے اور صاحب کے بغیر کسی بھی صاحبہ کا نہ تو کوئی حق تھا نہ مداوا۔ آپ آج بھی ان عورتوں کو سنیں جو ٹیلی ویژن پر آکر عورتوں کو حقیقی اسلام سکھا رہی ہوتی ہیں تو آپ حیران ہوں گے کہ وہ کیسے اللہ کی ایک مکمل خود مختار مخلوق یعنی عورت کو نامکمل ثابت کر دیتی ہیں تاکہ اس کا خود کا کوئی وجود باقی نہ رہے۔ اب مردوں کو یہ کام کرنے کی بھی محتاجی نہیں رہی۔

مگر اس کے برعکس ہم قرآن کو دیکھیں تو آپ حیران ہوں گے کہ قرآن میں جو چند الفاظ سب سے زیادہ بار استعمال کیے گئے ہیں ان میں سے ایک لفظ ایمان ہے اور ایمان کی عملی تعریف صرف ایک بار

بیان کی گئی ہے کہ ایمان کی مثال کیا ہے؟

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ

اور اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لئے فرعون کی بیوی کی مثال بیان فرمائی (التحریم 11)

آٹھ سو سے زیادہ بار ایمان لفظ استعمال کیا گیا مگر جب ایمان کی مثال پیش کرنے کی باری آئی تو کسی مرد، سورما یا عالم کو بطور مثال نہیں پیش کیا گیا بلکہ ایک عورت کو، جو نہ حکمران ہے نہ عالمہ ہے نہ مذہبی رسومات کو ادا کر سکتی ہے نہ ان کا پرچار، فقط ثابت قدم ہے۔ یہ ایک عورت پوری دنیا میں رہتے دم تک تمام ایمان والوں کے لئے اللہ کے نزدیک سب سے بہترین عملی نمونہ ہے، یہ ایک ایسی صاحبہ ہے جس کا صاحب اس کے بالکل برعکس ہے اس لیے اس صاحبہ کا یہ مقام کسی صاحب کی وجہ سے نہیں ہے، اس کا اپنا ذاتی اور صفاتی ہے۔ اللہ نے اس دلیل سے ثابت کر دیا کہ کوئی صاحبہ کسی صاحب کے مرہون منت نہیں ہے۔

صاحبہ کو یقین ہونا چاہیے کہ دنیا میں کسی بھی صاحبہ کو اپنا مقام پیدا

کرنے کے لیے کسی بھی صاحب کی محتاج نہیں ہے۔

یہ وہ غبار ہے جسے ہمیں اپنے دماغوں سے جھاڑنا ہے ورنہ ہم ایسی صاحبہ کا صاحب ہوتے ہوئے بھی دنیا کے بدترین انسان یعنی فرعون شمار ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

جاری ہے ۔۔۔

معصوم گناہ - قسط نمبر 1

آج سے تیس سال قبل ایک دفعہ تین سال سے چھوٹے دو بچوں کو ایک غلط حرکت دیکھا، مجھے دیکھ کر وہ فوراً بھاگ گئے، دو باتیں مجھے حیران کر گئیں، پہلی یہ کہ دو اڑھائی سال کے بچوں میں تو ابھی بلوغت کے آثار تک نہیں ہوتے پھر وہ ایسا کام کیوں کر رہے تھے۔ یقیناً انھیں کچھ سرور آرہا ہوگا مگر اس عمر میں یہ ممکن ہی نہیں تو پھر وہ ایسا کیوں کر رہے تھے؟ دوسری حیرانی کی بات یہ تھی کہ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ کام اچھا نہیں ہے کیونکہ مجھے دیکھ کر ان کا فوراً بھاگ جانا اسی بات کی گواہی دے رہا تھا۔

انسانی نفسیات پر ڈھیروں کتابیں پڑھیں مگر وہ اس عمر کے متعلق ایسے کاموں کا جواب دینے سے قاصر تھیں، جن سائیکالوجی اور جنسیات کے ماہرین تک میری پہنچ تھی وہ سب بھی تشنگی دور کرنے میں ناکام تھے۔ الغرض کہیں سے جواب نہ مل پا رہا تھا۔ اس واقعہ کے دس سال بعد قصور شہر میں بابا بلھے شاہ کے مزار کے قریب میں اپنی سوچوں میں مگن تھا کہ مزار سے باہر بیٹھے قوال نے ہارمونیم اور طبلہ کے سازوں کے ساتھ مل کر دھن کا آغاز کیا اور سلطان باہو کی

ابیات میں سے پہلی ہی رباعی پڑھی تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے حالات بھی اس کے پہلے مصرعے والے تھے

نہ رب عرش معلی اتے نہ رب خانے کعبے ہو
نہ تو رب عرش پر ہے نہ خانہ کعبہ میں ہے

سوچا مذہب اور مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کا یقیناً کوئی جواب ہوگا۔ ایک بڑے مولوی صاحب سے بڑی مشکل سے ملاقات کا وقت لیا، ان سے پوچھا کہ بچے اس عمر میں ایسا کوئی بھی کام کیونکر کر سکتے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو وہ کچھ اور کھیل رہے ہوں اور کھیلتے کھیلتے بھاگ گئے ہوں۔ مجھے جتنا وقت ملا تھا وہ اسی ناکام کوشش میں گزر گیا کہ وہ میری بات کو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی سچ مان جاتے اور جواب کی کوئی صورت نکلتی مگر ۔۔۔

قوال کافی دیر تک پہلے مصرعے کو دہرانے کے بعد دوسرے مصرعے تک پہنچ چکا تھا
نہ رب علم کتابیں ملیا نہ رب وچ محرابے ہو
نہ رب کتابی علم میں ملتا ہے نہ مسجد و مندر کے پجاریوں کے پاس

اس کے کچھ عرصہ بعد ہی ایک دفعہ لاہور مال روڈ کے فٹ پاتھ پر کتابیں خریدتے ہوئے اشفاق احمد صاحب سے ملاقات ہو گئی، میں نے ان سے پوچھا کہ کچھ پوچھ سکتا ہوں انھوں نے کہا ضرور، میں نے عرض کی

گناہ کی لذت انسان کو پہلے دی گئی اور گناہ کا شعور بعد میں تو کیا یہ انسان کے ساتھ نا انصافی نہیں ہے؟

وہ پہلے تو بولے کہ نا انصافی کس طرح سے ہوئی؟

میں نے وضاحت پیش کی کہ گناہ کی لذت دو سال کی عمر میں مل گئی اور بچے نے گناہ کرنا شروع کر دیا کیونکہ اسے سرور آتا تھا مگر ابھی عقل و شعور ہے نہیں کہ وہ اس گناہ کو گناہ سمجھے اور اصلاح کرے۔ جب تک اصلاح کی عمر آئے گی وہ اتنا عادی ہو چکا ہوگا کہ چھٹکارا مشکل ہو جائے گا۔
وہ کہنے لگے گناہ کی لذت اور شعور ایک ساتھ آتا ہے۔

میں نے کہا حضرت! شعور تو کبھی اٹھارہ سال سے پہلے نمودار نہیں

ہوتا بلکہ کئی لوگ تو اس عقل کے مقام کو پچیس یا تیس سال کی عمر میں حاصل کر پاتے ہیں تب تک کتنے ہی لوگ اپنے اپنے گناہوں کی دلدل میں اتنا دھنس چکے ہوتے کہ انھیں دلدل میں ہی سکون محسوس ہوتا ہے اور وہ اس سے باہر نہیں نکلنا چاہتے ۔

خیر میں انھیں اس بات پر نہیں منا سکا کہ لذت پہلے ملتی اور شعور بعد میں اور یہ عدل کے خلاف ہے۔ شاید میرا سوال ہی فضول تھا یا انکے پاس اسکا جواب نہیں تھا۔

ایک دفعہ اشفاق صاحب کے گھر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں بانو آپا (آپا میں نے ان کو اس لیے کہا کہ سب انھیں ایسا ہی کہتے ہیں وگرنہ وہ اس وقت بھی میری دادی کی عمر کی تھیں) سے ملاقات ہو گئی اور میں نے یہی پلندہ انکے آگے بھی کھول دیا ۔ انھوں نے وہی راجہ گدھ والی کہانی سنائی جس میں بچوں کو ایسے مسائل کا سامنا اس لیے کرنا پڑتا کہ انکے والدین نے رزق حرام کھایا ہوتا جو اگلی نسل میں منتقل ہو جاتا ہے۔

میں نے عرض کی کہ ان بچوں کا اس میں کیا قصور؟

تو انھوں نے گفتگو کو رزق کی سائنس و فلسفہ سے نکال کر مذہب کی طرف موڑ دیا کہ ان کو جنت میں اجر ملے گا فلاں فلاں۔

یعنی بچہ ساری زندگی گناہ کرتا رہے یا پاگل پن کا شکار رہے صرف اس وجہ سے کہ اس کے والدین نے حرام کھایا ہوگا، یہ اس ہستی کا عدل نہیں ہو سکتا جسے میں خدا مانتا ہوں۔

سلطان باہو جیسے میرے کان میں اگلا مصرعہ بول رہے ہوں

گنگا تیرتھ مول نہ ملیا، پینڈے بے حسابے ہو
تیرتھ یاترا یا حج جیسی رسومات میں بہت پھیرے لگائے مگر اس کا مقصد حاصل نہ ہو سکا

عام انسان، عام طالب علم، عام تلاش میں نکلنے والا، سالک یا کھوجی جب اپنی کھوج پر نکلتا ہے تو مذہبی پیشواؤں، خانقاہوں، لکھاریوں، خطیبوں اور مقرروں تک ہی پہنچتا ہے اور میں نے ان میں سے کسی کو نے کو نہیں چھوڑا۔ مگر بے سود۔ اکثریت کے نزدیک یہ سوال ہی غلط تھا اور اقلیت کے نزدیک اللہ جنت میں حساب برابر کر دے گا۔

مجھے یقین تھا کہ میں کوئی پہلا شخص نہیں ہوں جسے اس طرح کے سوالات ستاتے ہوں اور نہ ہی میں پہلا کھوجی تھا جو کھوجنے نکلا ہو۔ مجھ سے پہلے اگر لاکھوں اس راہ پر چلے ہیں تو سینکڑوں نے منزل پائی ہو گی اور منزل پا کر پلٹنے والا سچا کھوجی پہلا کام یہ کرتا ہے کہ راستے میں نشانیاں چھوڑتا آتا ہے تاکہ اس کے بعد میں آنے والوں کو رہنمائی ملتی رہے اور انھیں پھر سے ان مشکلات میں سے نہ گزرنا پڑے۔

تو اگلا سوال یہ تھا کہ پھر وہ سب جوابات وہ نشانیاں کہاں ہیں ؟ کیا کسی تحریر سے ملیں گے تقریر سے یا تدبیر سے؟

حضرت عیسیٰ سے چھ سو سال قبل اور آج سے تقریبا دو ہزار سال پہلے چین میں ایک فلسفی، ایک سیانہ، ایک منزل پانے والا اور اسے لوگوں تک پہنچانے والا شخص لاؤذی تھا اس کی شخصیت پر بات کرنے کے لیے الگ کتب درکار ہوں گی، میں اس کی فقط ایک سطر کا سہارا لینا چاہتا ہوں، لاؤذی نے اپنی تلاش کے نچوڑ کو اس طرح پیش کیا تھا۔

جب شاگرد تیار ہو جاتا ہے تو استاد خود سامنے آ جاتا ہے۔

مجھے اس مصرعے پر یقین کی حد تک یقین ہے کیونکہ میں اپنی زندگی

میں سینکڑوں بار اس صورتحال سے گزرا ہوا ہوں ۔ اس مصرعے کا برعکس میں نے خود سے بنا لیا تھا کہ جب تک شاگرد ہی تیار نہیں تو استاد نہیں مل سکتا یا دیگر الفاظ میں جب تک متلاشی ہی نہیں نکلا ، راہنما کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

مجھے تلاش تھی پس مجھے جواب مل گیا، طبلے کی تال اور ہارمونیم کے سر دونوں مل کر سلطان باہو کی رباعی کے آخری مصرعہ سے فضا کو معطر کر رہے تھے

جد دا مرشد پھڑیا باہو مک گئے کل عذابے ہو
جب سے راہ دکھانے والا ملا ہے، تلاش کے ہر عذاب سے جان چھوٹ گئی ہے۔
سلطان باہو کی بھی اور میری بھی۔

اللہ تعالٰی ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جاری ہے ---

جھونپڑی کی نفسیات

تین دہائیاں قبل ہمارے ایک دوست اپنا بنگلہ بنا رہے تھے تو ان کے گھر آنا جانا ہوتا رہتا تھا۔ وہ ایک نئ آبادی تھی جس میں زیادہ تر پلاٹ خالی تھے۔ خالی پلاٹوں پر جھونپڑی والوں نے بسیرا کر لیا تھا۔ ہم اکثر اس دوست کے زیرِ تعمیر گھر پر اکٹھے ہو جاتے تھے اور کچھ کھانے پینے کی محفل جما لیتے تھے۔ ان دنوں اکٹھے ہو کر کھانا پینا اور ساتھ ٹیپ ریکارڈر پر میوزک سن لینا ایک بڑی عیاشی تھی۔ جو کھانا ضرورت سے زیادہ ہوتا تھا وہ عقب میں قائم جھونپڑی والوں کو دے دیا جاتا تھا جسے وہ نہایت شکر گزاری کے ساتھ قبول کر لیا کرتے تھے اور ہم تب یہ سمجھتے تھے یہ کوئی بڑی نیکی کا کام ہو رہا ہے۔ یوں میرا ان جھونپڑیوں میں آنا جانا شروع ہوگیا۔

ان کے ہاں صبح بہت جلدی ہوتی تھی، روشنی سے بہت پہلے وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر رفع حاجت سے فارغ ہوجاتے تھے۔ شرم و حیاء کا یہ پیمانہ ہر معاشرے میں ایک جیسا ہے۔ روز صبح تازہ آٹا گوندھ کر عورتیں اپنے خاوندوں کو مزدوری پر بھیج دیتیں اور بچوں کو کھلا پلا کر ساتھ کام پر لے جاتیں۔ چھوٹی عمر کی بچیاں ماؤں کے ساتھ گھروں

کی صفائیاں کرتیں اور اسی عمر کے لڑکے باپ کو مزدوری میں ہاتھ بٹاتے۔

جو جھونپڑی گھر سے زیادہ قریب تھی اس میں بھی ایک ایسا ہی پریوار رہتا تھا۔ عورت کے بچے چھوٹے تھے اس لئے وہ کام پر نہیں جاتی تھی بس اپنے محدود سے گھر اور اسکے اطراف کا خیال رکھتی تھی، کھانا بناتی، بچوں کو سنبھالتی، پانی بھرتی، صفائی کرتی اور خاوند کا خیال رکھتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی سمجھداری کی جھلک تھی۔ گہری سانولی رنگت میں اس کی آنکھوں کی چمک دیکھنے والوں کو حیران کر دیتی تھی۔

ایک دفعہ ہم نے آم کھانے کا پروگرام بنایا اور ساتھ دودھ بھی منگوا لیا۔ دودھ بہت زیادہ تھا تو چند آم اور کچھ لٹر دودھ لے کر میں اس جھونپڑی کی طرف لے گیا۔ بچے باہر کھیل رہے تھے اور ان کی ماں جس کو ہم باجی کہتے تھے وہ لکڑیوں سے آگ جلا رہی تھی۔ میں نے اس کو چیزیں پکڑائیں جو اس نے مسکراہٹ کے ساتھ لے لیں اور یہی ان لوگوں کا شکریہ کہنے کا انداز ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چیزوں کو دیکھ کر چمک، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور دل میں اپنے رب کا

شکرانہ تھا کیونکہ ایسا کھانا ان کے لئے من و سلوی سے کم نہیں تھا جو تیار ان کے دامن میں پہنچ جاتا تھا۔ لالچ اور شکرانہ، دونوں حالتوں میں چیزوں کو دیکھ کر آنکھوں میں چمک آجاتی ہے اس لیے یہ طے کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے کہ چمک کی وجہ لالچ ہے یا شکرانہ، شاید ان کے مابین کوئی باریک سی لکیر ہوتی ہوگی مگر مجھے پتہ نہیں کہیں اندر سے آواز آتی تھی کہ باجی کی آنکھوں میں شکرانے کی چمک ہے۔

باجی نے فورا دودھ کو ابالنے کے لئے برتن میں ڈال کر آگ پر رکھ دیا۔ مجھے ایک پلیٹ میں حلوہ ڈال کر دیا اور کہا بھائی لیں (ویسے وہ صرف پنجابی میں گفتگو کرتی تھیں)۔ میں نے کہا اسکو آدھا کر دیں اور کھانا شروع کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ بھی کسی نے ان کو دیا ہوگا اور شاید اس کے پاس اتنا ہی تھا جو اس نے سارا مجھے کھانے کو دے دیا۔ جھونپڑی والے لوگ ہماری طرح آنے والے وقت کی فکر میں اپنے آج کو خراب نہیں کرتے یہ صرف آج میں جیتے ہیں۔ میں چونکہ کافی عرصے سے وہاں جا رہا تھا اس لئے میں نے ان کو کسی بھی کھانے والی چیز سے انکار کرنا بند کر دیا تھا۔ ایک دفعہ انکار کرنے پر باجی کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے جیسے اسے یہ محسوس ہوا ہو کہ میں ان کا کھانا یا ان کے برتنوں میں نہیں کھانا چاہتا یا پھر ان سے کھانا

کھانا ہی نہیں چاہتا۔ اس لئے اب وہ جو بھی دیتیں میں اس میں سے کچھ نہ کچھ کھا لیتا۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے آگ میں سے ایک کوئلہ نکال کر دودھ میں پھینک دیا۔ اب سفید گرم ہوتے دودھ میں ایک کالے رنگ کا کوئلہ عجیب لگ رہا تھا۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا تو باجی نے دودھ کی طرف اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا

ددھ ایناں سونہڑاں اے اینوں نظر ای نہ لگ جاوے
(دودھ اتنا پیارا ہے اس کو نظر نہ لگ جائے)

نہ جانے کیوں تیس سال بعد بھی یہ جملہ، یہ لطیف سا جزبہ، یہ معصوم سی سمجھداری میں بھولنے سے قاصر ہوں۔ ان لوگوں میں عجب مزاج یہ بھی تھا کہ ان کی جو بھی اقدار تھیں، جو بھی پیمانے تھے اطوار تھے، انھیں اپنی اقدار کو کسی کے سامنے بھی کرنے میں کوئی شرمندگی نہیں ہوتی تھی۔ یہ کوئلہ دودھ میں تب تک رہتا تھا جب تک باجی اس دودھ کا آخری پیالہ کسی کو نہ دے دیتیں۔ انھیں کوئی خوف نہ تھا کہ اس میں کوئی گندگی ہو سکتی ہے یا جراثیم بھی ہو سکتے ہیں ۔

بھلے وقتوں کی کہانیوں میں کہیں لکھا ہے کہ ہماری دادیاں اور مائیں زمین سے کوئی بھی چیز اٹھا کر بسم اللہ پڑھ کر کھا لیا کرتی تھیں کیونکہ وہ جراثیم سے زیادہ اللہ سے ڈرتی تھیں۔

یہاں بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔

ایک دفعہ میں نے باجی کے چھوٹے بیٹے، جو صرف شلوار پہن کر گھوم پھر رہا تھا اور توتلہ بولتا تھا، میں نے اسے کہا تمھارا ناک دونوں کانوں کے بیچ پھنس گیا ہے، یہ بات جب بھی میں اپنے خاندان میں چھوٹے بچوں کو کہتا تھا وہ پریشان ہو جاتے تھے، کچھ اس جھنجھلاہٹ میں رو پڑتے اور اکثر تو اپنے والدین سے جا کر اس پریشانی کا حل بھی پوچھتے اور میں ان کو دیکھ کر خوب محظوظ ہوتا تھا۔

باجی کے بیٹے کو جب یہی کہا تو اس نے صرف دو سیکنڈ کے لیے میری بات پر سوچا اور فوراً بولا

چنگا اے نک تھلے نئ ڈگے گا
(اچھا ہے ناک نیچے نہیں گرے گا)

میں پہلی دفعہ کسے بچے کے ہاتھوں لاجواب ہو چکا تھا۔

امجد اسلام امجد صاحب نے کیا خوب لکھا تھا

جھونپڑی میں ہر ایک تلخی پیدا ہوتے مل جاتی ہے
اسی لیے تو وقت سے پہلے طفل سیانے ہو جاتے ہیں

ایک دفعہ مغرب سے کچھ وقت پہلے وہاں بیٹھے بیٹھے بادل گرجنے لگ گئے اور بوندا باندی چل پڑی، مجھ کچھ پریشانی ہوئی کہ ان کی جھونپڑی میں پانی آئے گا یا چھت ٹپکے گی اور ان کو مسائل کا سامنا ہوگا۔ میں نے باجی کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ بھی میرے چہرے پر پریشانی کو پڑھ رہی تھی، اس نے فوراً بچوں سے کہا چلو قمیزیں اتارو، سب بارش میں نہائیں گے۔ وہی ہوا، تھوڑی دیر میں طوفانی بارش شروع ہوگئی اور اس کے بچے نہانے اور پانی سے کھیلنے میں مصروف ہوگئے۔ میں بھی بھاگ کر دوست کے گھر چلا آیا، کافی دیر بادل گرجتے رہے، بارش برستی رہی، جب بارش رکی تو میں دوبارہ وہاں گیا۔ تب باجی جھونپڑی کے اندر چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، دوسری چارپائی پر اس کے باقی دو بچے سو رہے تھے ۔غالباً اسکا خاوند انھیں کے حقہ پی رہا تھا

اور میں بھی اسکے ساتھ نیچے دری پر بیٹھا تھا۔ باجی پر ہر تھوڑی بعد ایک پانی کا قطرہ چھت سے ٹپک کر گر پڑتا تھا مگر وہ اس پر توجہ نہیں کر رہی تھی۔ کچھ پیغامات دے کر جب میں واپس آنے لگا تو باجی نے حسبِ عادت اٹھنے کی کوشش کی تاکہ مجھے الوداع کرے، میں نے اشارے سے انھیں منع کیا تو وہ دوبارہ لیٹ گئیں۔ اسکے اٹھ کر بیٹھنے اور لیٹنے کے بیچ میں میری نظر پڑی تو باجی نے اپنی بیٹی کو اپنے بازوؤں اور ٹانگ کے نیچے چھپایا ہوا تھا تاکہ اس پر پانی کے قطرے نہ گریں۔

یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں پانی آگیا، میں اسی حالت میں گھر تک پہنچا۔ چارلی چپلن کی بات یاد آئی کہ مجھے بارش میں بھیگنا بہت پسند ہے کیونکہ اس میں کوئی میرے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ساری رات پانی کے قطرے اپنی بچی تک نہیں پہنچنے دے گی، یہ ماؤں کو کون سکھاتا ہے؟ کون اتنی محبت، اتنا احساس کوٹ کر بھرتا ہے انکے اندر؟ یقیناً ان کو یہ سب کچھ دینے والا خود بھی ایسا ہی ہوگا۔ کسی کو کچھ دینے کے لیے اپنے پاس اس چیز کا ہونا ضروری ہے، بھلے وہ عزت ہو یا محبت، قدر ہو یا احساس۔

کچھ عرصہ بعد وہ لوگ وہاں سے کوچ کر گئے ایک دن پہلے مجھے باجی

کے خاوند نے بتا دیا تھا۔ میں پھر بھی اگلے دن وہاں پہنچا، بلا وجہ اس خالی پلاٹ میں کھڑا رہا جہاں ایک دن پہلے ایک جھونپڑی تھی، جس میں کچھ لوگ رہتے تھے اور جہاں لوگ رہتے ہوں اسے گھر کہتے ہیں ۔

افتخار عارف صاحب نے لکھا ہے

تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات
سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں

خانہ بدوش جا چکے تھے، انھوں نے بھی پلٹ کر ضرور دیکھا ہوگا۔ اس جگہ کو جہاں ان کا گھر تھا۔ میں بھی وہاں سے چل پڑا اور نہ جانے کیوں بار بار پلٹ کے دیکھتا رہا۔

ایک دفعہ میں کسی مسئلے کی وجہ سے بہت افسردہ تھا اور کسی کام سے باجی کے پاس گیا۔ اس ذہین خاتون نے پہلے لمحے ہی میں میری پریشانی کو بھانپ لیا اور پوچھا تو میں نے بتایا کہ کچھ خاص نہیں ہے۔ اس نے اسرار کیا تو میں نے بات گھمائی کہ کسی سے جھگڑا ہوا ہے اور ہم

ناراض ہیں۔ باجی فوراً بولی

پہلاں رب رسدا اے فیر بندا رسدا
(پہلے رب ناراض ہوتا ہے پھر بندہ ناراض ہوتا ہے)

میرے پوچھنے پر اس نے مجھے مزید سمجھایا کہ ہم کچھ بھی کریں، غلط برا یا گناہ، اصل میں پہلے رب ناراض ہوتا ہےاور جب وہ ناراض ہوتا ہے تو بندے کے ارد گرد خود ہی مسائل آجاتے ہیں ہم سمجھتے ہیں کوئی بندہ ہمارے خلاف ہے، کوئی ہمیں نقصان پہنچانا چاہ رہا مگر اصل میں پہلے رب سے تعلقات خراب ہوتے ہیں پھر سب معاملات خراب ہوتے ہیں، چلتی ہوئی دکانوں پر بھی دھندہ بند ہو جاتا ہے۔ رب کو ہم خود ناراض کرتے ہیں اپنی حرکتوں سے تو راضی بھی ہم نے ہی کرنا ہے اپنی حرکتوں سے، جب وہ راضی ہو جاتا ہے تو روٹھے ہوئے لوگ بھی جلدی مان جاتے ہیں، دشمن دوست نہ بھی بنے تو نقصان نہیں پہنچا پاتا، بند دکان کے باہر آکر بھی گاہک کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ان پڑھ بول رہی تھی اور کائنات کے راز کھول رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

عیب نارمل

میں جہاں رہتا ہوں وہاں ایک ایسی فیملی بھی رہتی ہے جس کے بارے میں سب لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایب نارمل ہیں۔ میاں بیوی اور دوجوان بیٹا بیٹی ہیں ان کو صبح شام کی دوائیں کھانی پڑتی ہیں ورنہ ان کا یہ ایب نارمل پن حد سے باہر نکل جاتا ہے۔

ہماری بلڈنگ میں سولہ خاندان بستے ہیں، مجھے دفتر آتے جاتے مارکیٹ آنے جانے یا چہل قدمی کے لیے نکلتے اور پلٹتے وقت اس فیملی کے گھر کے سامنے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر ان کے گھر کا کوئی فرد باہر کھڑا ہو تو وہ دور سے ہی سلام پیش کردیتا ہے میں جواب دیتا ہوں پھر وہ کہتے ہیں "کیا حال ہیں" میں خیریت بتا کر جلدی سے گزر جاتا ہوں۔ اگر میں تھوڑی دیر میں ہی واپس آجاؤں اور وہ وہیں پر ہوں تو وہ دوبارہ سلام دعا کرتے ہیں۔ وہ ایب نارمل ہیں یا تو بھول جاتے ہیں یا شاید ان کے پاس کوئی بات کرنے والا نہیں ہے تو اس لیے دوبارہ سلام کرتے ہیں۔

آج پانچ سال ہو گئے یہاں رہتے ہوئے ،میں ایک بند مزاج انسان

ہوں، لوگوں سے کم مل پاتا ہوں، دوست اور جاننے والے بہت کم ہیں رابطے نہیں رکھ پاتا، اکیلے بیٹھنا اور سوچنا میری فطرت ہے اس لیے مجھے بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں۔ مجھے کوئی جانتا نہیں اس لیے مجھے کوئی بلاوجہ سلام بھی نہیں کرتا، یہ فیملی پھر بھی آتے جاتے مجھے سلام کرتی ہے کیونکہ وہ ایب نارمل ہیں۔

نوجوانی میں حدیث کے مطالعے کے دوران ایک حدیث پڑھی تھی جس میں ہمارے نبی کریم نے فرمایا تھا کہ لوگوں کو سلام پیش کیا کرو بھلے تم انھیں نہیں جانتے۔ میں نے یہ حدیث پڑھ رکھی ہے میں پھر بھی عمل نہیں کرتا کیونکہ میں نارمل ہوں۔ اس فیملی نے شاید یہ حدیث نہ پڑھی ہو مگر وہ عمل کرتے ہیں، وہ پھر بھی ایب نارمل ہیں۔

مارکیٹ سے اگر کچھ سامان خرید کر لا رہا ہوں اور میرے دونوں ہاتھوں میں وزنی لفافے ہوں اوپر سے دھوپ یا شدید گرمی ہو اور راستے میں ان سے سامنا ہو جائے تو وہ کھڑے ہو کر سلام کریں گے خیر خیریت پوچھیں گے اگر وہ سڑک کے دوسری جانب ہوں تو دھوپ کا خیال کیے بغیر میری طرف آ جائیں گے۔ میں گرمی دھوپ اور وزن کی وجہ سے تنگ ہوتا ہوں جلدی سے جواب دے کر نکلنے

کی کرتا ہوں۔

سیرت النبی میں لکھا ہے کہ عرب کی شدید گرمی میں جب ہمارے نبی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے رفقاء سے کسی اہم مشاورت میں مصروف ہوتے تھے تو وہاں ایک ایب نارمل عورت رہتی تھی جو دھوپ میں کھڑے ہو کر ہمارے نبی کو پکارتی تھی اور آپ اٹھ کر دھوپ میں چلے جاتے اور اس کی باتیں سنتے رہتے، وہ بولتی رہتی اور آپ سر ہلاتے رہتے، جب اس ایب نارمل کی باتیں ختم ہو جاتیں وہ چلی جاتی تو ہمارے نبی پسینے سے شرابور واپس آ کے بیٹھ جاتے، ساتھیوں کو برا لگتا بلکہ حضرت عمر نے تو ایک دفعہ کہہ بھی دیا کہ حضور وہ تو پاگل ہے اور آپ کو خواہ مخواہ گرمی میں پریشان کرتی ہے، آپ مسکراتے اور کہتے کوئی بھی اس کی بات نہیں سنتا اس لیے میں سن لیتا ہوں، کوئی بات نہیں۔

کہتے ہیں انسان کی شکر گزاری ہی اللہ کی شکر گزاری ہے۔ ہماری بلڈنگ میں خواتین ایک دوسرے کے گھروں میں کچھ نہ کچھ پکا کر بھجواتی رہتی ہیں، ہمارے گھر سے ان کے گھر جب بھی کوئی کھانے پینے کی چیز جاتی ہے اور اس کے بعد ان کے بچوں سے سامنا ہو جائے

تو وہ کہتے ہیں شکریہ انکل آپ نے ہمارے لیے فلاں چیز بھیجی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے پندرہ نارمل خاندانوں کی نارمل مائیں اپنے نارمل بچوں کو شکر گزاری نہیں سکھا رہیں، کسی بچے نے زندگی میں آج تک مجھے اس بات پر شکریہ نہیں کہا کہ ہم نے ان کے گھر کچھ کھانے کو بھیجا تھا، میرے بچے بھی نہیں کہتے۔ ایک ایب نارمل فیملی کی ماں اپنے ایب نارمل بچوں کو شکر گزاری کی تعلیم دیتی ہے اور وہ ایب نارمل بچے عمل بھی کرتے ہیں اور باقی ہم سب نارمل بڑے اپنے نارمل بچوں کو یہ نہیں سکھا رہے۔

میں نارمل ہوں اور وہ فیملی ایب نارمل ہے، عجیب بات ہے نا اور عجیب معیار بھی جو ہم سب نارمل لوگوں نے مل کر بنا رکھا ہے۔ ہم طے کریں گے کون نارمل ہے اور کون ایب نارمل۔ ہم ہر طرح کے عیب رکھتے ہوئے بھی نارمل رہیں گے اور جن کے ذہن ہماری طرح ہوشیاری اور چالاکی نہیں کر پا رہے ہوتے وہ ایب نارمل۔

مجھے لگتا ہے دنیا میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں ایک اس فیملی جیسے معصوم ایب نارمل اور دوسرے میرے جیسے جن کے لیے سب عیب نارمل ہیں، وہ ایب نارمل ہیں اور میں عیب نارمل ہوں کیونکہ میرے

لیے عیب ایک نارمل سی بات ہے۔

یاد رکھیں، سب عیب نارمل لوگ دوسرے عیب نارمل لوگوں کو نارمل سمجھتے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

Hassnain Malik

www.hassnainmalik.com
Email: imhassnain@gmail.com
Phone: +92 321 8470906
Twitter: @imhassnain
Facebook: @Hassnain.Malik.The.Trainer